آئی ایم ٹی پاکستان سیکشن میں حالیہ پھوٹ کے اسباب و اسباق

انقلابی تنظیم اور مارکسی نظریات

”صرف بذاتِ خود عوام کے اندر سیاسی عوامل کے مطالعے کی بنیاد پر ہی ہم پارٹیوں اور قیادتوں کے کردار کو سمجھ سکتے ہیں جن کو ہم کم سے کم نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ وہ آزادانہ نہیں بلکہ سارے عمل میں بہر صورت ایک انتہائی اہم عنصر کے طور پر شامل ہوتی ہیں۔ ایک رہنما تنظیم کے بغیر عوام کی تمام تر توانائی اس بھاپ کی طرح جسے پسٹن کے ڈبے میں بند نہ کیا گیا ہو، ضائع ہو جاتی ہے۔ لیکن بہر حال جو چیز عمل کو تحرک بخشتی ہے وہ پسٹن یا ڈبہ نہیں بلکہ بھاپ ہی ہوتی ہے۔“ لیون ٹراٹسکی (انقلابِ روس کی تاریخ کا دیباچہ)

عالمی سیاسی افق پر رونما ہونے والے حالیہ واقعات کا تسلسل لیون ٹراٹسکی کے ان الفاظ کو ایک بار نہیں بار بار من و عن درست ثابت کر رہا ہے۔ سماج کی تبدیلی کی خواہش آبادی کی اکثریت میں بغیر اپنا احساس دلائے موجود ہوتی ہے۔ بحران کے دور میں رفتہ رفتہ یا وقتاً فوقتاً یہ اپنا احساس دلانا شروع کر دیتی ہے۔ ہم عالمی سطح پر ایسے ہی بحرانی دور میں جی رہے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی حالیہ تحریکوں سے لے کر خاص طور پر ہندوستان میں کروڑوں محنت کشوں کی عام ہڑتال جہاں بحرانی کیفیت کا اظہار ہیں وہاں اسے اور بھی گہرا کرتے جا رہے ہیں۔ یہ صورتحال بالآخر سماج میں ایک انقلابی کیفیت پر منتج ہوتی ہے۔ انقلاب سے پہلے کا یہ بحرانی دور انتہائی دشوار گزار اور متنوع مزاج ہوتا ہے۔ اس دور میں بار بار محنت کش عوام کی مختلف پرتیں الگ الگ ایک دوسرے سے کٹ کر سماج کو بدلنے کی کوشش کرتی ہیں مگر بار بار کی ناکامی سے بدظنی اور مایوسی غالب آنا شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ایک ایسی منظم، فعال اور مستعد سیاسی قوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ہر دشوار گزار مرحلے پر نہ صرف عوام کے شانہ بشانہ موجود رہے بلکہ ان کی بکھری ہوئی بغاوت کو مجتمع کرتے ہوئے اسے ایک ناقابلِ تسخیر قوت میں تبدیل کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات، روایات اور ہوا کے رخ پر چلنے والی پارٹیوں اور قیادتوں کے بس کی بات نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کے تناظر سے لیس اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تنظیم اور قیادت ہی یہ تاریخی فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔

کسی بھی تنظیم یا قیادت کی اس تاریخی فریضے کو پورا کرنے کی اہلیت کا انحصار اس کے سیاسی نظریات پر ہوتا ہے۔ ہر عہد میں مروجہ سیاست کے مخصوص سیاسی نظریات ہوتے ہیں جن کے ذریعے حکمران طبقات اپنی بالادستی کو سماج پر مسلط کئے ہوتے ہیں۔ انہی نظریات پر یقین رکھنے والی پارٹیاں کبھی بھی سماجی تبدیلی کے عمل کا اوزار نہیں بن سکتیں۔ اس مقصد کے لیے ایسے نظریات درکار ہوتے ہیں جو سماج اور اس کی معیشت کا سائنسی تجزیہ کرتے ہوئے سماجی تضادات کا قابلِ عمل حل پیش کر سکیں۔ سرمایہ دارانہ سماجی ارتقا کے موجودہ مرحلے میں مارکسی نظریات سے زیادہ جدید اور مفید نظریات ابھی تک سامنے نہیں لائے جا سکے۔ اس ضمن میں مارکسزم کے متبادل کے طور پر پیش کئے جانے والے تمام نظریات فرسودہ، بوسیدہ اور آزمودہ ہیں۔ مابعد جدیدیت یا مابعد مابعد جدیدیت کے نام پر تمام تر متروک اور مسدود صدیوں پرانی فلسفیانہ دقیانوسیت نسلِ نو کے دماغوں میں انڈیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ عین اس وقت جب مارکس کے تمام تر تناظر اور تجزیئے تاریخ کی کسوٹی پر پورا اتر رہے ہیں تو نئی نسل کی توجہ مبذول کر کے انہیں گمراہ کیا جا سکے۔ حکمران طبقہ بھی اپنی تمام تر جہالت کے باوجود اس سچائی سے باخبر ہے کہ صرف اور صرف مارکسی نظریات پر تعمیر شدہ ایک انقلابی پارٹی ہی یہ تاریخی فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات مابعد جدیدیت کو مارکسزم ہی کی نئی اور ترقی یافتہ شکل قرار دیا جاتا ہے یا پھر اس نام نہاد نئے فلسفے کے مبلغین بھی 'مارکسی لبادہ' پہننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

بین الاقوامی تنظیم کی لازمیت

مارکس کے عہد میں ابھی یورپ کے بھی بڑے حصے میں بورژوا انقلابات کا عمل جاری تھا جہاں بورژوازی کسی حد تک ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کر رہی تھی۔ اس وقت سرمایہ داری کا نظریہ نیشنلزم تھا جس نے جاگیردارانہ مطلق العنانیت کے خاتمے کو عملی جامہ پہنایا۔ اس کے باوجود مارکس نے کسی بھی ملک یا خطے کی قومی پارٹی کی تشکیل

نہیں کی بلکہ ایک محنت کشوں کی بین الاقوامی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ سرمایہ دارانہ سماج کا سائنسی تجزیہ کرتے ہوئے کارل مارکس نے ایک عالمگیر معیشت اور سیاست کی پیشگوئی کی تھی جو کہ آج سو فیصد درست ثابت ہو چکی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ معیشت میں عالمی سطح پر اس حد تک مرکزیت ہو چکی ہے جو اسے اجتماعی ملکیت میں لئے جانے کے لئے ضروری اور سازگار ہے۔ نیشنلزم تاریخ کے ہاتھوں متروک ہو چکا ہے اور ایک نظریاتی بین الاقوامیت ڈیڑھ سو سال قبل کی نسبت زیادہ موزوں اور لازمی ہو چکی ہے۔ نیشنلزم کسی اور تاریخی منزل کا نمائندہ نظریہ تھا، اب ہم کسی اور عہد میں رہ رہے ہیں۔ اس لئے آج کا انقلابی نظریہ اپنے انجام نہیں بلکہ اپنے آغاز میں بین الاقوامی ہے۔

مارکس نے مصنوعی طور پر مختلف خطوں اور قوموں کے پرولتاریہ کو ایک طبقہ بنانے یا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ سرمایہ داری کے طرزِ ارتقا کی وجہ سے پرولتاریہ کی طبقاتی عالمگیریت کو دریافت کیا تھا۔ ایک مارکسی بین الاقوامی تنظیم مختلف قوموں، ملکوں، نسلوں، زبانوں یا ثقافتوں کی تنظیموں کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی اکائی ہوتی ہے جو کرہ ارض پر محکوم و مظلوم طبقات کو پرولتاریہ کی قیادت میں متحد اور منظم کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ مارکسی بین الاقوامی کوئی فیڈریشن یا کنفیڈریشن نہیں ہوتی جس میں مختلف ثقافتی پس منظر کے پرولتاریہ کے سیاسی مقاصد اور عزائم کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے الگ الگ تناظر اور طریقہ کار مرتب کیا جائے بلکہ عالمی سوشلسٹ انقلاب کے لئے ایک عمومی تناظر اور طریقہ کار تشکیل دیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ مختلف ثقافتی اور سیاسی پس منظر کے اندر اس طریقہ کار کو کس لائحہ عمل کے ذریعے عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ انٹرنیشنل کے الگ الگ سیکشنز (Sections) کی تشکیل کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر خطے کے محنت کشوں کے سیاسی مفادات الگ الگ ہیں بلکہ انقلابی نظریات کی بڑھوتری، لاجسٹکل اور تکنیکی دشواریوں سے بچنے کے لئے ذیلی ادارے تشکیل دیئے جاتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ایک سیکشن میں مختلف ریجنز اور ایریاز وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ مختلف زبانوں میں انقلابی پرچے شائع کئے جاتے ہیں تاکہ محنت کشوں کی ہر پرت تک ان نظریات کی رسائی ممکن ہو لیکن عالمی تناظر ایک ہی ہوتا ہے جسے مختلف زبانوں میں ترجمے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ عالمی مارکسی رجحان (IMT) اور اس کا پاکستانی سیکشن 'لال سلام' بین الاقوامیت کے اسی اٹوٹ اور مرکزمائل تعلق میں منسلک ہیں۔

ڈھانچے اور ڈسپلن

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مارکسی نظریات پر قائم کی جانے والی پارٹی کا ڈسپلن اور ڈھانچے کس طرح کے ہونے چاہئیں اور پارٹی کا داخلی تانا بانا کن خطوط پر استوار کیا جائے؟ اس سوال کا جواب سب سے پہلے تو سماج میں مختلف طبقات کے مابین قوتوں کے توازن، انقلاب کے کردار اور تحریک کی شدت اور نوعیت کو مدِ نظر رکھ کر ہی دیا جا سکتا ہے۔ اگر تو پارٹی سمجھتی ہے کہ انقلاب کا کردار اور مطالبات جمہوری نوعیت کے ہیں اور انقلاب کی قیادت بورژوا طبقے کو کرنی ہے تو ڈھیلے ڈھالے ڈسپلن اور برائے نام ڈھانچوں کے ساتھ بھی تحریک میں مداخلت کرتے ہوئے سیاسی عمل میں کلیدی کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بورژوازی پہلے ہی بڑے پیمانے پر جدید پیداواری قوتوں کی ملکیت رکھنے والا طبقہ ہوتی ہے اور اس کے مدِ مقابل انتہائی غیر منظم اور سیاسی طور پر کند جاگیردارانہ باقیات ہوتی ہیں۔ لیکن اگر تحریک سوشلسٹ کردار کی حامل ہے اور پرولتاریہ ہی اس کی قیادت کا حامل طبقہ ہے تو سخت گیر ڈسپلن اور انتہائی فعال ڈھانچوں کے بغیر ایسے انقلاب کی قیادت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ پرولتاریہ اچھی خاصی تعداد میں ہونے کے باوجود سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر بے حد مفلوک الحال بے ملکیت طبقہ ہوتا ہے اور اس کا ٹاکرا انتہائی منظم اور راسخ ڈھانچوں والی ریاستی مشینری اور سیاسی نظام سے ہوتا ہے۔

گزشتہ پوری صدی کے تجربات بار بار یہ ثابت کر چکے ہیں کہ پاکستان سمیت تیسری دنیا کے ممالک اور اقوام کی بورژوازی جمہوری تقاضے پورے کرنے کی اہل نہیں جس کی وجہ سے پرولتاریہ ہی واحد انقلابی طبقہ رہ جاتا ہے۔ اس لئے ان ممالک کی تحریکیں جمہوری مطالبات سے آگے بڑھ کر ملکیتی رشتوں کو چیلنج کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پر انقلابی سیاست کی دعویدار پارٹی کا منظم اور سخت ڈسپلن ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تاہم تنظیم سے پارٹی کی طرف سفر کے دوران ڈھانچے شکل اور کردار کے حوالے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بالشویک پارٹی کی طرز پر ڈسپلن اور ڈھانچوں کا بنیادی اصول جمہوری مرکزیت پر مبنی ہونا چاہئے تاکہ ایک طرف تو تنظیم یا پارٹی کے کارکنان کو فیصلہ سازی کے عمل میں زیادہ سے زیادہ شامل کیا جا سکے اور دوسری طرف تنظیم کے محض ایک ڈسکشن کلب تک محدود ہو جانے کے امکانات کو مسدود

کرتے ہوئے سیاسی عمل میں بروقت اور موثر مداخلت کو جاری رکھا جاسکے۔ جمہوری مرکزیت کا اصول کسی دماغ کی من موجی اختراع نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی تنظیم کے کام کو چلانے اور آگے بڑھانے کا واحد قابلِ عمل اور موثر طریقہ کار ہے۔

جمہوریت کے وکلا چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ یوں تو آمریت مسلط کر دی جائے گی اور تحریر و تقریر کی آزادی جیسے بنیادی حقوق سلب ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خواتین و حضرات عموماً دانستہ انقلابی پارٹی کے ڈسپلن اور ڈھانچوں کو کمیونسٹ سماج کے اداروں کے ساتھ خلط ملط کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ کنفیوژن پھیلائی جا سکے۔ کمیونسٹ سماج کے برعکس ایک انقلابی تنظیم میں کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے عملی کام یا بڑے سے بڑے نظریاتی مسائل کے حل کے لئے کی جانے والی بحثوں میں برانچ سے لے کر ورلڈ کانگریس تک سب کو بیک وقت شریک نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی بھی اتفاقِ رائے پیدا کیا جاسکتا ہے جس پر سب لوگ بیک وقت متفق ہو سکیں۔ یہ یوٹوپیا ہمیں واپس انارکزم کی طرف لے جاتا ہے۔ 'ہر معاملے میں ہر کسی کی رائے لی جانی چاہئے' کی رَٹ لگائے رکھنے والے دراصل اپنی مرضی مسلط کرنے کا 'جمہوری' راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں اور اس بنا پر دوسروں کو اکسا کر آخری تجزیئے میں مخالف طبقات کی خدمت ہی سر انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ عام طور پر زیادہ تر کام چور اور مشکلات سے راہِ فرار کے متلاشی لوگوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر اپنے کام، قربانی اور لگن کے بلبوتے پر منتخب ہونے کی نااہلیت کی وجہ سے تخریب کارانہ چور راستے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

تو کیا ہم اداروں اور افراد کی آمریت کے حامی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ برانچ جو تنظیم کا بنیادی ادارہ ہوتا ہے۔ اس کے ہر ممبر کو اپنے ایریا اور ریجن کی قیادت اور کانگریس کے لئے مندوبین کو منتخب کرنے کے لئے ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کانگریس اپنی سنٹرل کمیٹی کو ووٹ کے ذریعے منتخب کرتی ہے اور سنٹرل کمیٹی سنٹرل سیکرٹریٹ کے ممبران کا انتخاب کرتی ہے۔ اسی طرح IEC کی سلیٹ ورلڈ کانگریس میں منظور کی جاتی ہے جو انٹرنیشنل سیکرٹریٹ کو منتخب کرتی ہے۔ ان تمام اداروں کے کام کے دائرہ کار، معیاد (Tenure) اور اختیارات وغیرہ کے حوالے سے تفصیل دستور میں درج ہے۔ ہم مارکسی ہر ریجنل، سیکشن اور ورلڈ کانگریس میں ہر منتخب شدہ مندوب کا کسی بھی تنظیمی یا سیاسی سوال پر اختلاف کرنے کا حق نہ صرف تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس کا ہر ممکن دفاع بھی کرتے ہیں۔ یوں ان اداروں میں اکثریتِ رائے سے کئے گئے فیصلوں کا احترام اور ان پر عمل کرنا ہر کارکن کا نظریاتی، سیاسی، تنظیمی اور اخلاقی فریضہ بن جاتا ہے۔ یہی جمہوری مرکزیت ہے اور صرف اور صرف اسی ڈسپلن اور انہی ڈھانچوں کے ذریعے ہی مارکسی نظریات کی روشنی میں پرولتاریہ کی آمریت (سوشلسٹ ریاست) کے لئے جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ اس کے الٹ یا مخالف ڈسپلن کے حامی بنیادی طور پر مخالف طبقات اور دشمن نظریات کے نمائندے ہیں۔

آخر ٹوٹ پھوٹ (Splits) کیوں ہوتی ہیں؟

پہلی انٹرنیشنل سے لے کر عالمی مارکسی رجحان تک بائیں بازو کی ساری تاریخ بے شمار ٹوٹ پھوٹ سے بھری پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دائیں بازو والے اور خاص طور پر ان کے مڈل کلاسیے نقاد ہمیں ان ٹوٹ پھوٹ کے طعنے دے کر تمسخر اڑاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جس نظام اور سماج کے یہ نمائندے اور رکھوالے ہیں اس سماج میں خاندان سے لے کر فوج تک ریاست کا ہر ادارہ شدید خلفشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ یہ ان کے ثقافتی اور اخلاقی دوہرے معیار ہی ہیں جو ان اداروں کو قائم اور برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی دوسرے سے آگے نکل جانے کے چکر میں ہے۔ ملکیت اور اتھارٹی میں اضافے کی نفسیات سماج کے رگ وپے میں سرائیت کر چکی ہے۔ نام نہاد یگانگت اور جڑت کی باریک تہہ کے نیچے نفسا نفسی کا ایک ادھم مچا ہوا ہے۔ اداروں اور نظام سے لگاؤ صرف اسی لئے ہے کہ انہی کے بلبوتے پر استحصال اور لوٹ مار کا یہ بازار گرم ہے۔ یہ لوگ چیزوں کو جیسا ہے ویسے ہی کی بنیاد پر جاری رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ کچھ خود ساختہ انقلابی بھی ان ٹوٹ پھوٹ کی آڑ میں جمہوری مرکزیت کے سائنسی اصول پر تنقید کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اسے ہی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ قرار دے دیتے ہیں۔

دوسری طرف انقلابی سیاست کے دھارے کا کردار اور مزاج ہی یکسر مختلف ہے۔ یہ پانی کے مخالف سمت میں تیرنے کے مترادف ہے۔ اس میں سماج میں ہونے والی ہر چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی کا گہرائی میں مشاہدہ کرتے ہوئے سماجی حرکت کی عمومی سمت اور پھر اس کی روشنی میں کام کے اہداف اور ان اہداف کے حصول کے طریقوں کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے قدم قدم پر مختلف آرا اور نقطہ ہائے نظر سے پالا پڑتا رہتا ہے۔ جب تک یہ اختلافات مختلف رجحانات کی شکل میں اپنا اظہار نہیں کرتے اور جب تک یہ رجحانات تنظیم کے روزمرہ کے کام میں بحیثیتِ مجموعی رخنہ ڈالنے کا باعث نہیں بنتے تب تک ایک ہی تنظیم اور پارٹی میں کام جاری رکھنا ممکن ہوتا ہے لیکن

پھر ایک وقت میں علیحدگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ عمومی روایتی سوچ کے برعکس ہم مارکسی اسے عین فطری اور منطقی امر تصور کرتے ہیں۔ تضادات زندگی کی علامت ہیں۔ زندہ تنظیمیں صرف بنتی ہی نہیں ٹوٹتی بھی ہیں۔ بورژوا پارٹیوں کی نسبت مارکسی پارٹیوں میں ٹوٹ پھوٹ زیادہ ہونے کی وجہ عام طور پر معروضی حالات کی سفاکیت، اختلافات کا مصلحتوں کا شکار نہ ہونا اور سماج کی تبدیلی کے لئے غیر معمولی ثابت قدمی کی ضرورت کا ہونا ہے۔ مارکسی فلسفہ تضادات سے فرار کی بجائے ان کا سامنا کرتا ہے، انہیں قبول کرتا ہے اور انہی کے بلبوتے پر اپنی ترقی اور ترویج کے عمل کو جاری رکھتا ہے۔ مارکسی پارٹیاں بھی اسی طریقے سے اپنے کام کو جاری رکھتی ہیں۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ ٹوٹ پھوٹ منطقی ہے لہٰذا جو کوئی بھی علیحدہ ہوتا ہے یا اختلافات رکھتا ہے وہ درست ہے یا یوں کہہ لیں کہ پھوٹ کے سب فریقین بیک وقت درست سیاسی سمت اور نظریاتی ورثے سے منسلک ہیں؟ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ یہ درست ہے کہ مارکسی پارٹیاں کسی خلا میں تعمیر نہیں ہوتیں بلکہ زندہ سماج میں کام کرتی ہیں اور ان کے پاس ایسا کوئی دیومالائی فارمولا نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر وہ سماجی ثقافت، مخالف طبقات اور ریاستی مداخلت کے اثرات کو سو فیصد خارج از امکان قرار دے سکیں۔ بہت سے لوگ انقلابی پارٹیوں میں مذموم مقاصد کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں جو تنظیمی ٹوٹ پھوٹ کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ایسا ان پارٹیوں اور تنظیموں کے ساتھ ہوتا ہے جو سماج میں اپنی بنیادیں استوار کر چکنے کی وجہ سے ایک طرف حکمران طبقات کے لئے خطرہ بن چکی ہوں اور دوسری طرف پٹی بورژوا مفاد پرستوں کے لئے کشش رکھتی ہوں۔ اس کے برعکس چھوٹی چھوٹی تنظیموں میں بات بات پر ریاستی مداخلت کا شور و غوغہ اس چرواہے کی یاد دلاتا ہے جو داخلی خوف کی وجہ سے 'شیر آیا، شیر آیا' کا شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا کرتا تھا اور جس دن واقعی شیر آیا تو کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔

اس بیہودہ وضاحت کے برعکس علیحدگیاں عام طور پر سنجیدہ سیاسی اور نظریاتی سوالات پر ہوتی ہیں۔ اور علیحدہ ہونے والے فریقین میں سے کوئی ایک ہی معروضی امکانات کی درست نظریاتی تشریح کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ کی کسوٹی پر جلد یا بدیر غلط اور صحیح کا فیصلہ ہو جانا ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ سب انقلابی کام ہی تو کر رہے ہیں، یا سب مارکسی یا سوشلسٹ ہی تو ہیں لہٰذا سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں پٹی بورژوا رومانیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ عام طور پر تمام تر نیک نیتی کے باوجود کچھ افراد یا تنظیمیں پوری دیانتداری اور تن دہی سے حکمران طبقات کے ہاتھ میں محنت کش طبقے کے خلاف آلہ کار کے طور پر استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ نظریاتی کمزوری ہی ہوتی ہے جو شخصی اور فروعی تنازعات میں اپنا اظہار کر رہی ہوتی ہے۔ یہی نظریاتی کمزوری ہی نیک نیتی اور اخلاص کو اپنے الٹ میں تبدیل ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بڑی بڑی تقریروں اور تحریروں میں صرف اور صرف لفظ باقی رہتے ہیں اور معنی ناپید ہو جاتے ہیں۔ تعقل عدم تعقل بن جاتا ہے اور اس کے خلاف ناقابلِ مصالحت جدوجہد ہر مارکسی کیڈر پر فرض ہو جاتی ہے تاکہ نسلوں کی محنت اور رہنمائی پر مبنی نظریاتی ورثے کا تحفظ کیا جاسکے۔

پاکستانی سیکشن کی حالیہ پھوٹ (Split) 2016ء کی وجوہات اور اسباق

حالیہ پھوٹ سے قبل پاکستانی سیکشن IMT کا سب سے بڑا سیکشن تھا۔ گزشتہ تین دہائیوں میں پاکستان سیکشن کی بڑھوتری اور دیگر یورپی سیکشنز کی بظاہر سست روی کی وجوہات محض موضوعی یا صرف معروضی نہیں تھیں بلکہ ان دونوں عناصر کے باہمی تعلق پر مبنی تھیں۔ جدلیاتی طور پر اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو دیکھا جاسکتا ہے کہ یورپی سیکشنز میں بظاہر جمود کے باوجود مستحکم ڈھانچے اور نظریاتی کیڈرز کی تعمیر کا سلسلہ سست روی سے ہی سہی مگر جاری و ساری رہا جس کے ثمرات ابھی نظر آنا شروع ہوئے ہیں جبکہ پاکستانی سیکشن کی بظاہر تیز ترین بڑھوتری انتہائی سطحی اور گمراہ کن ثابت ہوئی کیونکہ نظریاتی ڈسپلن، ڈھانچوں اور اداروں کی پختگی کے حوالے سے ساری گفتگو ہمیشہ لفظی جگالی تک محدود رہی اور اس سلسلے میں کوئی زیادہ سنجیدہ کام نہیں کیا جاسکا اور اس ضمن میں کی گئی تمام کوششیں کارگر نہ ہو سکیں۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی سیکشن کششِ ثقل کے قوانین کے برخلاف مصنوعی طور پر نمو پاتا رہا اور یوں جعلی اعداد و شمار کی مرہونِ منت ایک مصنوعی بلبلہ بنتا چلا گیا جس کا ایک خاص وقت میں جا کر پھٹنا ناگزیر تھا۔

یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ پاکستانی سیکشن کی بڑھوتری عین اسی وقت میں ہوئی جب پاکستانی معیشت بھی بظاہر مسلسل ترقی کرتے ہوئے 7.5 فیصد کی شرح تک پہنچ گئی تھی۔ اس نمائشی ترقی کے سماج پر ہونے والے اثرات کا میکانکی طور پر نہیں بلکہ جدلیاتی طور پر تنظیم کی عددی ترقی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی عرصے میں تعداد میں کم ہونے کے باوجود تنظیم میں تعمیر ہونے والے کیڈرز کو تنظیمی صورتحال اور خامیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ظاہری نمائش و آرائش کے اندر معاملات مسلسل بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے 2015ء کی کانگریس میں تنظیمی امور پر سخت تنقیدی بحث کا آغاز کیا گیا۔ کانگریس کے فوری بعد مرکز میں گومگو کی صورتحال کے

باوجود ریجنز کو ڈیٹا فارم ارسال کئے گئے تاکہ ممبر شپ کی حقیقی صورتحال سامنے لائی جاسکے جس میں ماہانہ فنڈ (Subs) کی ادائیگی کو ممبر شپ کی بنیادی شرط کے طور پر عائد کیا گیا۔ دو سے تین ماہ میں جمع ہونے والے اعداد و شمار سے تنظیم کی سابقہ قیادت کو شدید دھچکا لگا کیونکہ ممبر شپ یک لخت 2500 سے کم ہو کر 1500 کے لگ بھگ رہ گئی تھی۔ یعنی تقریباً 40 فیصد کے قریب ممبر شپ جعلی نکلی۔ حقیقی کیڈرز جانتے تھے کہ صورتحال اس سے بھی زیادہ دگرگوں ہے اور ابھی بھی 400 سے 500 کے درمیان جعلی ممبر شپ کو ندامت اور خجالت کے احساس کے باعث چھپالیا گیا ہے۔ اس سے تنظیم کے اندر ان افراد کی انا بہت مجروح ہوئی جو ہر وقت یہ جتاتے رہتے تھے کہ انہوں نے انتہائی مشکل معروض میں معجزاتی طور پر یہ انقلابی تنظیم تیار کرلی ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تنظیم کے بالا اداروں میں اس صورتحال پر سنجیدہ بحث کا آغاز کیا جاتا اور اس گورکھ دھندے کی وجوہات تلاش کی جاتیں اور پھر اس بحث کو برانچ کی سطح تک اتارتے ہوئے نئے عزم اور حقیقت پسندانہ ولولے کے ساتھ حقیقی بالشویک پارٹی کی تعمیر کا سفر شروع کیا جاتا۔ مگر سارے عمل کو سمجھنے کی بجائے اس اعداد و شمار میں کمی کا ملبہ چند کلیدی کامریڈوں کے سر ڈال کر اپنی جھوٹی انا کو تسکین دینے کے لئے بہت سے "پرانے" کامریڈ سرگرم ہو گئے۔ یہ بہت منطقی سی بات تھی کہ اگر ماضی کی بڑھوتری کی وجہ کوئی کرشماتی شخصیت تھی تو حالیہ گراوٹ کی وجہ کوئی نااہل فرد یا افراد ہی ہوں گے۔ یہ تنظیم کو سمجھنے کی ایک طفلانہ روش تھی جس کا حقیقی بالشوازم سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ہم حالیہ پھوٹ کو اس سے قبل 2008ء میں ہونے والی پھوٹ کا ہی تسلسل سمجھتے ہیں کیونکہ اُس پھوٹ میں بیماری کی محض علامات کا علاج ہوا تھا جبکہ اصل وجوہات کو تلف نہیں کیا جاسکا تھا۔ درحقیقت اس پھوٹ کے بعد موقع پرستی اور مفاد پرستی کی دلدل میں گرنے والے ممبران کی زوال پذیری کی وجوہات پر بحث نہیں کی گئی تھی بلکہ ایسی کسی بحث کو سختی سے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ پھوٹ کے بعد انٹرنیشنل سے الگ ہونے والوں کا کم و بیش وہی موقف ہے جو 2008ء میں الگ ہونے والوں کا تھا۔

اس بیماری نے تنظیم کی بنیادوں کو مزید کھوکھلا کردیا تھا اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے زیادہ تر کامریڈز لکیر کے فقیر بن گئے تھے۔ سہل پسندی، ثقافتی زوال اور بے عملی تنظیمی معمول کا حصہ بنتے چلے گئے۔ موجودہ لال سلام کے کامریڈز نے ہی 2008ء کی پھوٹ میں موقع پرستی کے خلاف فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اور اس کے بعد بھی انہوں نے پرانے سیکشن کے اندر اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی اور اپنی زیادہ تر توجہ کام کو فروعی انداز میں پھیلانے کی بجائے کیڈرز کی سیاسی و نظریاتی تربیت کی طرف راغب کردی۔ لیکن تنظیم کی قیادت پر مسلط اجارہ دار اشرافیہ کو یہ سب بہت ناگوار گزر رہا تھا اور نئے کیڈرز کے آنے سے ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس تقویت پکڑتا گیا۔ مگر ہم نے اپنی جدوجہد جاری رکھی، یہی وجہ ہے کہ ہم آج معیاری کیڈرز کی ایک اچھی خاصی تعداد کے ساتھ نیا اور تازہ دم آغاز کرچکے ہیں۔ پرانے سیکشن کی "اکثریت" ناقابلِ اصلاح گراوٹ کی دلدل میں دھنس چکی تھی اسی لئے انہوں نے حزبِ مخالف کی قیادت کو ایکسپل کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ دلائل کے ذریعے سیاسی طور پر مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، اسی لئے انہوں نے تنظیمی اور بیوروکریٹک حربے استعمال کئے۔ مگر ان سب حیلوں اور چالاکیوں کے باوجود وہ جانتے تھے کہ کہیں سے بھی کوئی سنجیدہ سوالات اٹھ سکتے ہیں، اس لئے انہوں نے اس امکان کا راستہ بھی بند کرنے کی کوشش کی اور خود تمام کلیدی کامریڈوں کو ایکسپل کر کے پھر مظلومیت کا سوانگ بھی خود ہی رچانا شروع کردیا۔ ہر طرف اک شورشِ آہ و فغاں تھا کہ دیکھو دیکھو ہم نے اتنی مشکل سے یہ تنظیم بنائی تھی اور آج ہمارے ساتھ بدسلوکی یا بدتمیزی کی جا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یوں انہوں نے اس پھوٹ کو اپنی سیاسی پوزیشن پر نہیں بلکہ جھوٹی ہمدردیاں بٹور کر پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اب سائنسی فہم و بصیرت رکھنے والا ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جھوٹی ہمدردیوں کی طبعی عمر بہت زیادہ نہیں ہوا کرتی۔

یہ پھوٹ ماضی کی تمام ٹوٹ پھوٹ سے اس حوالے سے مختلف تھی کیونکہ اس میں پہلی بار اکثریت IMT سے علیحدہ ہوگئی۔ اکثریت نے پہلے جھوٹ، بہتان طرازی اور مکاری کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے IMT کی قیادت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی اور جب تمام جھوٹ اور مکاری کا پردہ فاش ہوگیا تو فرار کا رستہ اختیار کرتے ہوئے IMT سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ خود IMT کی قیادت کا ایک سنجیدہ امتحان تھا۔ انہوں نے پاکستانی سیکشن میں بحران کی حقیقی نوعیت کو سمجھ لیا تھا اور ممکنہ پھوٹ سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کی۔ فروری میں ہونے والی IEC کی میٹنگ میں متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں بحران کا بہترین حل پیش کیا گیا۔ سابقہ سیکشن کی قیادت نے منافقانہ رویہ اپناتے ہوئے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا مگر بعد ازاں اکثریت کی دھونس دکھاتے ہوئے IMT کی قیادت پر قرارداد کو تبدیل کرنے کے لئے دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔ IS کے کامریڈ اس ناانصافی پر مبنی آمرانہ رویے کے مقابل ڈٹ گئے اور انہوں نے مارکسی روایات اور بالشویک اصولوں کے مقابلے میں نام نہاد اکثریتی دھڑے کی تمام تر بلیک میلنگ کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے یہ ثابت کردیا کہ وہ مارکسزم کے ان ٹوٹ دھارے سے منسلک ہیں۔ بعد میں جولائی میں ہونے والی ورلڈ کانگریس میں اکثریتی دھڑے کو مدعو کیا گیا مگر وہ بحث سے بھاگ گئے اور ورلڈ کانگریس نے متفقہ طور پر 'لال سلام' کو IMT کے پاکستان سیکشن کا

درجہ دے دیا۔ اس پھوٹ سے اہم اسباق حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام تر وجوہات، محرکات اور متنازعہ نکات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ ذیل میں چند اہم نکات کا تفصیلی جائزہ لیا جا رہا ہے :

i۔ معروض کی تبدیلی

پاکستانی سیکشن کی تعمیر کا آغاز 69-1968ء کی انقلابی تحریک کی فیصلہ کن پسپائی کے بعد 1980ء کی دہائی میں ہوا تھا۔ یہ بہت مشکل معروضی صورتحال تھی جو سوویت یونین کے انہدام کے بعد انتہائی شکل اختیار کر گئی۔ جبر، مایوسی اور بدگمانی کی یہ کالی رات بہت طویل تھی۔ اس عہد میں انٹرنیشنل کی رہنمائی میں پاکستانی سیکشن کے کامریڈز نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ سیکشن کی تعمیر کا کام شروع کیا مگر سوویت یونین کے انہدام کے فوری بعد ہی انٹرنیشنل کو ایک عالمی سطح کی پھوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ سوویت یونین کا انہدام ایک ایسا بھیانک اور دیوہیکل واقعہ تھا جس نے معروض کو فیصلہ کن انداز میں ردِ انقلاب کے حق میں جھکا دیا تھا۔ یہ ایک تبدیل شدہ صورتحال تھی اگرچہ انٹرنیشنل کے پاس اس کا تناظر موجود تھا مگر پھر بھی انٹرنیشنل کی اکثریت اس دیوہیکل واقعے کا بوجھ سہار نہ سکی اور دولخت ہو گئی۔ اکثریت ہوا کے رخ کے ساتھ بہہ گئی اور ٹیڈ گرانٹ نے بہت کم قوتوں کے ساتھ ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ پاکستان میں بھی چند کامریڈز کے ساتھ نئی شروعات کی گئی۔ اس ردِ انقلابی دور میں تنظیم کو آگے بڑھانے کے لئے کام کی جو روٹین بنی اس نے کامریڈوں کے ایک مخصوص مزاج اور تنظیمی رویئے کو جنم دیا۔ اس عہد کے بہت زیادہ طوالت اختیار کر جانے کے باعث یہ روٹین بہت گاڑھی اور مستقل شکل اختیار کر گئی۔

پھر 2008ء کے عالمی معاشی بحران سے قبل یہ رجعتی عہد عالمی سطح پر اپنی انتہاؤں پر پہنچ گیا تھا۔ سوشلزم کی ناکامی کا شور مچانے والے ڈوبتی ہوئی سرمایہ داری کی وکالت کرنے میں بری طرح ناکام ہونے لگے۔ محنت کش طبقہ بحران کی وجہ سے عالمی سطح پر سکتے کی کیفیت میں چلا گیا۔ پاکستان میں بھی 2007ء میں ہی بے نظیر کے استقبال کے گرد ایک تحریک بننا شروع ہوئی تھی مگر بے نظیر کے قتل کے بعد پھر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ 2009ء میں ایران میں ایک شاندار تحریک دیکھنے میں آئی۔ 2011ء کی عرب بہار نے سوویت یونین کے انہدام کے بعد کے جمود کو کاری ضرب لگائی اور ایک نئے عہد کے آغاز کا طبل بجا دیا۔ IMT نے بھی اپنے عالمی تناظر کی دستاویزات میں بار بار عہد کی تبدیلی کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ یہ دستاویزات پاکستان میں بھی نیشنل کانگریسوں کے لئے ہر سال اردو میں شائع کئے جاتے رہے اور اتفاقِ رائے سے منظور بھی ہوتے رہے۔ اس صورتحال میں پاکستانی سیکشن میں بھی عہد کی تبدیلی اور پاکستان کے معروضی حالات کے اوپر ایک نئی بحث کا آغاز ہونا ناگزیر تھا۔ پرانی روٹین کا شکار کامریڈز لفظ 'تبدیلی' سے ہی اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہوں نے سنٹرل کمیٹی میں واضح طور پر معروض میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے امکان کو ہی مسترد کر دیا۔

'ہم ایک مشکل ترین رجعتی معروض میں رہ رہے ہیں' یہ جملہ گزشتہ 25 سالوں سے اتنا زیادہ بولا گیا تھا کہ یہ ایک ناقابلِ تغیر مطلق سچائی لگنے لگا تھا۔ جب کسی دیوانے نے صدا لگائی کہ 'معروض بدل گیا ہے' تو فوراً شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کہا گیا کہ دنیا چاہے ساری ہی بدل جائے پاکستان میں وہی رجعتی معروض ہے جو ضیاء الحق کے دور میں تھا اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد اور گہرا ہو گیا تھا۔ اس ردِ عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ معروض کے بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ تنظیم کو بھی بدلنا ہو گا۔ روٹین کو بھی مرنا ہو گا اور نئے معمول کا جنم ناگزیر ہے۔ تنظیم کے بدلنے سے مراد یہ تھی کہ ان کامریڈوں کو بھی بدلنا ہو گا جو اپنے ماضی میں کئے گئے تھوڑے بہت انقلابی کام کی بنیاد پر 'تاحیات' تنظیمی پوزیشنوں اور بالخصوص سنٹرل کمیٹی پر براجمان ہیں۔ جن کی نوکریاں، کاروبار، خاندان اور باقی روزمرہ کے معاملات میں انقلاب کو اگرچہ ایک ثانوی یا فروعی حیثیت حاصل ہے مگر سماج میں اپنی انفرادیت اور علمی برتری کا رعب قائم رکھنے کے لئے انقلابیت کا لیبل موزوں اور مفید بھی ہے۔ ظاہر ہے نئے تنظیمی معمول میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اپنی مخصوص ذہنی کیفیت کے ہتھوڑے تبدیل شدہ معروض پر برساتے چلے گئے حالانکہ اس سے معروض کا کچھ نہیں بگڑا۔ دوسری طرف سماج کی انقلابی جراحی کے لئے کسی بھی حد سے گزر جانے کا جذبہ لئے نوجوان کامریڈوں کی نئی پرت تاریخی فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ یہ سابقہ شخصی قیادت کا پہلا سنجیدہ امتحان تھا۔ وہ روٹین کے خلاف لڑنے کی بجائے خود روٹین کا مجسم اظہار بن گئی۔ ہم نے سابقہ قیادت کو اس انجام سے بچانے کے لیے سر توڑ کوششیں کیں مگر کسی شاعر نے سچ ہی کہا تھا کہ 'اسے میں کیسے بچاؤں جو ڈوبنا چاہے'۔

ii ۔ طریقہ کار کا استصنام(Fetishism)

پاکستان میں موجودہ معروضی حالات پر تو تفصیلی بحث پاکستان تناظر کی دستاویز میں کی جائے گی۔ البتہ یہاں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ گزشتہ تیس سالوں سے ایک ہی ڈگر پر چلنے والے اور کسی معروضی تبدیلی کو محسوس یا تسلیم نہ کرنے والے مارکسی سائنس کی 'الف، ب، پ' سے بھی نا آشنا ہیں۔ صرف کمپیوٹر، موبائل ٹیکنالوجی، الیکٹرانک میڈیا اور خاص طور پر سوشل میڈیا نے شعور، نفسیات اور سماجی معمول پر جتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں ان کا مفصل جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ دیہی ثقافت میں بھی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں اور کیبل نیٹ ورک اور ٹی وی ڈراموں کے ذریعے گاؤں پہنچنے والی بیہودہ گلیمرائزیشن اور اس کے ساتھ ساتھ گاؤں سے بڑی تعداد میں شہروں میں روزگار کے سلسلے میں آنے والے نوجوانوں کی سوچ کی کمرشلائزیشن کے واپس دیہی زندگی پر اثرات نے سماجی بندھنوں کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام اور اس کے ساتھ جڑی معاشرتی روایات دم توڑ چکی ہیں۔ اس تیز ترین اربنائزیشن (شہروں کی طرف دوڑ) نے شہری مڈل کلاس اور پرولتاریہ کی نامیاتی تشکیل اور نفسیاتی و شعوری سطح پر بھی اہم اثرات ڈالے ہیں۔ پاکستان کی حالیہ نوجوان نسل اپنے مزاج، اپروچ اور شعور کے حوالے سے گزشتہ نسل سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے سوالات بالکل مختلف ہیں اور ان کو پرانے رٹے رٹائے جوابات سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ تو کیا ہمیں نئے نظریات کی ضرورت ہے؟ مارکسزم پرانا ہو چکا؟ اس سوال کے جواب میں ہم صرف اتنا ہی کہیں گے کہ عہد اور معروض کے بدلنے سے وہ نظریات پرانے اور بوسیدہ ہوتے ہیں جو کسی بھی قسم کی تبدیلی کے امکان پر یقین نہ رکھتے ہوں یا 'تبدیلی مخالف' مواد کے پرچارک ہوں۔ مارکسزم تو ہے ہی تغیر کی سائنس۔ یہ تبدیلی تو مارکسیوں کے لئے عین متوقع اور قابلِ قبول ہے اور اسے سمجھا ہی صرف اور صرف مارکسی سائنس کے ذریعے جا سکتا ہے۔ ہاں البتہ جنہوں نے مارکسی فلسفے کو میٹرک بورڈ کے امتحان کی تیاری کی طرح یاد کیا ہوا تھا ان کا انگشت بدنداں ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

تو انقلابیوں کو موجودہ عہد میں جو چیز بدلنے کی ضرورت ہے وہ ان کا نظریہ نہیں بلکہ اس نظریئے کو نئی نسل تک پہنچانے کا طریقہ کار ہے۔ مذکورہ رجعتی دور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف محنت کشوں کی سابقہ نسل کی خوش گمانیاں اور غلط فہمیاں تھیں، اس وجہ سے پیپلز پارٹی میں کام کا طریقہ کار اپنایا گیا جو کہ درست تھا۔ لیکن اس طریقہ کار سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لئے برتا گیا لائحہ عمل سراسر غلط اور غیر انقلابی تھا۔ یہ دلیل دے کر کہ چونکہ جمود کا دور ہے اور محنت کش متحرک نہیں ہیں، اس لئے پارٹی میں نیچے کارکنان کی سطح پر کام کے مواقع نہیں ہیں، پارٹی کے اندر پارٹی بیوروکریسی اور وزیروں کے ذریعے اوپر سے پارٹی میں مداخلت کی گئی۔ عوامی کام اور دباؤ کے برعکس ذاتی اثر و رسوخ اور تعلق واسطے کی بنیاد پر الیکشن ٹکٹ لئے گئے اور غیر جمہوری نامزدگیوں پر مبنی عہدے لئے گئے۔ 2002ء کے الیکشن میں حادثاتی طور پر قومی اسمبلی کی ایک نشست IMT کے پاکستانی سیکشن کو مل گئی تو مفاد پرستی کے نئے باب کا آغاز ہوا۔ محنت کشوں میں تنظیم کی بنیادیں نہ ہونے کی وجہ سے منتخب رکن قومی اسمبلی کا مخالف طبقات کے دباؤ میں آنا ناگزیر تھا۔ دوسری طرف موصوف کی 'چال ڈھال' دیکھ کر پیپلز پارٹی میں کام کرنے والے دیگر کامریڈوں کی بھی ہر وقت رال ٹپکنے لگی تھی۔ یوں پارٹی کے کام کے خمیر کے اندر ہی مفاہمت اور موقع پرستی شامل کر کے اس کی انقلابی روح کو ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ اگر کسی نے بھی پارٹی کے اندر لیفٹ اپوزیشن کی طرز کی تنقید کرنے کی کوشش کی تو اگرچہ پارٹی کارکنان میں اس عمل کی پذیرائی موجود تھی، پھر بھی اسے مہم جوئی قرار دے کر پرانی مفاہمتی روش کو جاری رکھا گیا۔ پارٹی کے اندر سنجیدہ مداخلت کی ایک بڑی کوشش PSF پنجاب میں ایک سیاسی لڑائی لڑتے ہوئے کنونشن کا انعقاد تھا لیکن چونکہ عمومی طور پر پیپلز پارٹی میں کئے گئے سارے کام کی بنیادیں ہی مفاہمتی اور لین دین کی سیاست پر رکھی گئی تھیں اس لئے تنظیم پیپلز پارٹی کے کام کے معاملے پر ٹوٹ گئی اور 2008ء میں ایک پھوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔

بے نظیر کی واپسی پر عوام نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ بے نظیر کی نیت اور ارادے سے قطع نظر عوام کی امنگوں اور خواہشات کو شخصی اظہار مل رہا تھا۔ اسی اثنا میں ریاستی دھڑوں کی آپسی لڑائی میں بے نظیر قتل ہو گئی اور تحریک بھی پسپائی کی طرف جانا شروع ہو گئی۔ زرداری نے اقتدار میں آ کر لوٹ مار، ریاستی گماشتگی اور محنت کشوں پر بہیمانہ حملوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ مرکز کے علاوہ، سندھ، کشمیر، پشتونخواہ اور بلوچستان میں بھی پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ پنجاب میں پارٹی کا گورنر براجمان تھا۔ بھٹو کی حکومت کے بعد پہلی دفعہ مرکز میں پارٹی کو پانچ سالہ اقتدار کا موقع ملا تھا۔ عوام کی کسک اور امید دم توڑ گئی اور وہ ایک بار پھر سیاسی بیگانگی میں چلے گئے۔ لیکن اسی عرصے میں محنت کشوں کی ایک نئی نسل جوان ہو چکی ہے جو بھٹو یا بے نظیر نہیں صرف زرداری کی پیپلز پارٹی سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 2011ء کی عرب بہار کے بعد پاکستان میں چلنے والی کوئی بھی تحریک پیپلز پارٹی کی جھولی میں نہیں گری۔ KESC، OGDCL، واپڈا، ریلوے، ڈاکٹرز، ٹیچرز، PIA، نرسیں، پیرامیڈیکل سٹاف، کسان، طلبا غرضیکہ کسی بھی شعبے اور کسی بھی ادارے کی تحریک نے پیپلز پارٹی کے دروازے پر دستک دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ایسے میں انقلابیوں کا پیپلز پارٹی کی

دہلیز پر محنت کشوں کا انتظار کرنا مضحکہ خیز اور قابلِ رحم ہے۔ جبکہ انہی سات آٹھ سالوں میں محنت کشوں، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بے شمار طلبا اور دیگر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بہت سے ہمارے رابطے صرف ہمارے پرچے پر پیپلز پارٹی کے نام کے باعث بہت سی بنیادی چیزوں پر ہم سے متفق ہوتے ہوئے بھی ہم سے دور چلے گئے۔ ابھی حال ہی میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں بھی سابقہ سیکشن کے کچھ کامریڈوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ کی وجہ سے اپنی ضمانتیں ضبط کروائیں۔ در اصل موجودہ عہد عالمی سطح پر روایتوں کے ٹوٹنے کا عہد ہے۔ پیپلز پارٹی بھی محنت کش طبقے کی روایت کے طور پر اپنا مقام کھو چکی ہے۔ طبقاتی یا وفاقی کردار ترک کر کے سندھ کی پارٹی کا کردار اپنا چکی ہے۔ ایسے میں ہم پیپلز پارٹی میں انٹر ازم کی پالیسی کو ترک کرتے ہوئے آزادانہ کام کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی انہونی نہیں ہے جو مارکسی بنیادوں پر پہلے کبھی نہیں کی گئی۔

اس بحث مباحثے کا جب آغاز ہوا تو سابقہ سیکشن کے کچھ کامریڈز کا کہنا تھا کہ 'اگر ہم پیپلز پارٹی چھوڑ دیں گے تو انٹر ازم کیسے اور کہاں کریں گے؟' اس سوال کے اندر ہی بہت سارے جوابات چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی طریقہ کار کو حتمی اور مستقل سمجھنے کی بیماری۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس بیماری کو نظریاتی جواز فراہم کرنے کے لئے لینن (بائیں بازو کا کمیونزم، ایک طفلانہ بیماری) کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ اس کتاب کا اگر عرق نکال لیا جائے تو اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ 'انقلابی پارٹی کی تعمیر کا کوئی ایک فارمولا نہیں ہے'۔ اور اسی کتاب کو ایک فارمولے کے طور پر یاد کروانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہی حال ٹیڈ گرانٹ کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور انٹر ازم اور روایتی پارٹیوں کو نا قابلِ تغیر ازلی اور ابدی فارمولا بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہمیں تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ٹیڈ گرانٹ غلط ہے؟ ہم انتہائی عاجزانہ جواب دیتے ہیں کہ ٹیڈ گرانٹ کا طریقہ کار نہ صرف یہ کہ درست تھا بلکہ اس وقت واحد کارآمد نسخہ تھا۔ ٹیڈ گرانٹ کی جو چیز آج بھی اسی طرح قابلِ تقلید ہے وہ اس کا میتھڈ (Method) ہے۔ مزید برآں ٹیڈ گرانٹ نے کہیں بھی کسی بھی روایتی پارٹی کو تا قیامت روایتی پارٹی ہونے کی بشارت نہیں دی تھی۔

سماج میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زیادہ سمجھ بوجھ نہ ہونے کے باعث مکمل طور پر دیگر لوگوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ عام طور پر انہیں 'ملنگ' یا 'مولائی' کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جلد یا بدیر درباروں اور مزاروں پر ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ اس 'روایت' کے تحت ان روایت پرست نام نہاد انقلابیوں کو 'فار مولائی' کہا جانا چاہئے۔ طریقہ کار کا تعلق تناظر سے اور لائحہ عمل کا مجرد نظریئے کی بجائے ٹھوس سماجی حالات سے ہوتا ہے جو ہمارے 'فار مولائیوں' کی خواہشات کے برعکس صرف مقداری ہی نہیں بلکہ معیاری تبدیلیوں کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ سبق جو یاد کیا گیا تھا کہ 'ہر سماج میں محنت کشوں کی ایک روایتی پارٹی ہوتی ہے، پیپلز پارٹی پاکستان کے محنت کشوں کی روایت ہے، انقلاب کا راستہ اسی سے ہو کر گزرتا ہے' اب پرانا ہو چکا ہے۔ سادہ سی حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی ایک بورژوا پارٹی ہے جس میں محنت کشوں کی خوش فہمیاں تھیں جو اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں اور اگر بچی بھی ہیں تو مقداری اور معیاری حوالے سے ان کی نوعیت ایسی نہیں کہ کمیونسٹوں کے لئے وہاں پر جانا واجب ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اگر کوئی کامریڈ پیپلز پارٹی کے کسی پروگرام میں شرکت کرتا ہے تو فوراً اسے غدار کہہ کر لعن طعن شروع کر دی جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب نیا فارمولا بنانے کی کوشش کی جانی چاہئے بلکہ نظریات پر اٹل رہتے ہوئے طریقہ کار پر لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے نت نئے تجربات کرنے چاہئیں۔

iii۔ اوپن یوتھ ورک

جس مرکزی نکتے پر آ کر تمام تر تضادات پھٹ کر سامنے آئے وہ نوجوانوں کا کام تھا۔ برسوں کے محنت طلب کام کے بعد تنظیم کے اندر نوجوان کیڈرز کی ایک تازہ دم پرت تیار ہو چکی تھی۔ خاص طور پر سالانہ دو نیشنل مارکسی سکولوں اور سہ ماہی ریجنل سکولوں کے انعقاد کی وجہ سے نوجوان کامریڈوں کی اکثریت نے لگے بندھے کلیوں سے ہٹ کر آزادانہ تخلیقی کام کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ فلسفے، معیشت اور تاریخ کے اہم ترین موضوعات پر بحث کا سلسلہ موجودہ 'لال سلام' کے کامریڈز نے ہی شروع کیا تھا۔ خاص طور پر 'سرمایہ' کے اوپر ایک منظم انداز میں اتنے بڑے پیمانے کی تربیتی نشستیں اس ملک میں شاید ہی ماضی میں کبھی ہوئی ہوں۔ نئے کیڈرز کی یہی وہ پرت تھی جس کا پرانے معمول میں دم گھٹنے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 2011ء کے بعد ریکروٹ ہونے والے کامریڈز کی بہت بڑی تعداد 'لال سلام' کے ساتھ جڑ گئی۔ بلکہ کراچی، لاہور اور فیصل آباد جو پاکستان کے تین سب سے بڑے شہر ہیں ان میں تو گزشتہ چھ سات سالوں میں ریکروٹ ہونے والے نوجوانوں کا بالترتیب 95، 100 اور 60 فیصد 'لال سلام' کا حصہ بن گئے۔ اسی طرح ملتان ریجن میں ہونے والی نئی ریکروٹمنٹ کا 80 فیصد سے زائد جبکہ بلوچستان اور پشتونخواہ کے کیڈرز کا 90 فیصد سے بھی زیادہ عالمی مارکسی رجحان سے وابستہ ہو گئے۔ پرولتاری مراکز سے دور دیہی علاقوں میں کیڈر بلڈنگ کا عمل نسبتاً سست رفتار ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ

’اکثریت‘ کے زعم میں مبتلا ہو گئے، لیکن کشمیر سے بھی دو فل ٹائمرز سمیت حقیقی کیڈرز کی خاطر خواہ تعداد نے نظریاتی استقامت کا ثبوت دیا۔ کچھ اچھے اور پر عزم نوجوان اس عمل میں ضائع بھی ہوئے لیکن جیسے کہا جاتا ہے کہ ’گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے‘۔ ایسے ہی ان چیدہ چیدہ مخلص اور دیانتدار نوجوانوں کے ضیاع کو تاریخی عمل کی ’زکوٰۃ‘ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہئے۔

نوجوان کیڈرز کی یہی پرت اوپن یوتھ ورک کی متقاضی تھی۔ جب پروگریسو یوتھ الائنس (PYA) بنانے کی تجویز زیرِ بحث آئی تو ان نوجوانوں نے اس تجویز کا ولولہ انگیز خیر مقدم کیا۔ سابقہ قیادت نے کبھی اس کے نام پر، کبھی طریقہ کار پر اعتراضات اٹھائے۔ کبھی یہ کہا گیا کہ حالات سازگار نہیں ہیں لہٰذا یہ تجربہ ناکام ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام متذبذب اعتراضات کے باوجود ہم PYA کے کنونشن کا انعقاد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ملک بھر میں بالعموم اور لاہور میں بالخصوص PYA کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بہت زیادہ رسپانس ملا اور تقریباً 1500 کے لگ بھگ نوجوانوں نے کنونشن میں شرکت کی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ کامیاب کنونشن کے بعد ’ناقدین‘ اپنا قبلہ درست کرتے اور اس کام کو مزید آگے بڑھانے کے لئے سرگرم ہو جاتے۔ مگر اس کے برعکس وہ اس کامیابی سے اور خوفزدہ ہو گئے اور برملا کہنے لگے کہ PYA تنظیم کو کھا جائے گی جیسے PYA کوئی بھوت ہو۔ بہت سے پرانے کامریڈوں نے زور دیا کہ یہ مہم جوئی ہے، ہمیں بلوچستان میں BSO اور پشتون SF اور پنجاب اور سندھ میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن (PSF) میں ہی کام کرنا چاہئے۔ ہم نے سمجھانے کی ہزار کوشش کی کہ محترم صاحبان اگر لاہور، فیصل آباد یا اسلام آباد کے کسی ایک بھی کالج اور یونیورسٹی میں PSF وجود نہیں رکھتی تو پہلے PSF کو بنانا اور پھر اس میں کام کرنا کوئی زیادہ عقلی کام نہیں لگتا۔ خدارا اپنی ذہنی صحت پر غور فرمائیں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور فرمانے لگے کہ ’ یہی جدلیات ہے، جو چیز نہیں ہے وہ ہے اور جو ہے وہ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ‘۔ کچھ زیادہ ’پڑھے لکھے‘ صاحبان کا خیال تھا کہ ’ آپ لوگوں کی بات میں کوئی وزن (Substance) نہیں ہے‘۔ سابقہ سیکشن کے ’روحِ رواں‘ نے انٹرنیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کے نام اپنے خط میں واشگاف الفاظ میں لکھا کہ ’فرنٹس متوازی تنظیم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس لئے مضر ہیں‘۔ نوجوان کیڈرز کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ اوپن یوتھ ورک سے پسپائی اختیار کریں اور صرف ’ریکروٹمنٹ‘ کا کام کریں۔ کب، کہاں اور کیسے فرنٹس کے بغیر ریکروٹمنٹ کی جائے؟ اس سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

ہم اب چھوٹی قوتوں کے ساتھ نسبتاً مختلف طریقے سے ہی سہی مگر PYA کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ کی تیاری سے ہم دوبارہ سپورٹس ٹورنامنٹس، مووی پروگرام، سٹڈی سرکلز، تقریری مقابلے، مشاعرے، میوزیکل نائٹس، سیمینار، رجسٹریشن کیمپس اور دیگر ثقافتی و سیاسی سرگرمیوں کے تسلسل کے بعد PYA کے مرکزی کنونشن کے انعقاد کی طرف بڑھیں گے۔ BSO اور پشتون SF میں ہمارے رابطوں اور کامریڈوں کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے جبکہ JKNSF کی بھاری اکثریت سابقہ سیکشن کے ساتھ ہے۔ لیکن JKNSF کے پہلے بھی بہت سے دھڑے کام کر رہے ہیں جو قومی دھارے کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں اور ان تمام دھڑوں سے اس دھڑے کا امتیاز اس کی IMT سے منسلکیت ہی تھا۔ اب باقی دھڑوں اور اس دھڑے میں تعداد کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس کشمیر میں اتنی ممبر شپ موجود ہے کہ ہم JKNSF کے اپنے دھڑے کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ JKNSF کی مزید ٹوٹ پھوٹ سے کشمیر یں عمومی سیاسی عمل میں بائیں بازو کو وقتی طور پر نقصان ہی ہو گا۔ اس لئے JKNSF کی موجودہ قیادت جس کی نظریاتی کمزوری اور تنظیمی نااہلیت حالیہ تنظیمی بحران میں کھل کر سامنے آئی ہے، جو روزانہ گھنٹوں کے حساب سے اپنا موقف اور ’وفاداریاں‘ بدلتے رہے ہیں بہت جلد JKNSF کے سنجیدہ نوجوانوں کے سامنے ننگے ہو جائیں گے اور ان کے بولے گئے تمام جھوٹ منظرِ عام پر آ جانے کے بعد JKNSF میں موجود مارکسی سمجھ بوجھ رکھنے والے نوجوان دوبارہ عالمی مارکسی دھارے کی طرف لوٹیں گے۔ لیکن ساتھ ہی کشمیر کی سیاست میں JKNSF کے باہر بھی تازہ دم نوجوانوں میں نئے اوپن فرنٹ کی گنجائش بن رہی ہے، اس لئے وہاں پر آئندہ مہینوں میں نئے تجربات بھی کئے جائیں گے۔ مزید بر آں بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں بھی روایتی طلبہ تنظیموں کے ساتھ ساتھ اوپن یوتھ ورک کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد ان روایتی تنظیموں سے باہر موجود ہے اور ان میں PYA کا کام بنایا جا سکتا ہے۔

iv۔ ’انرجی بچاؤ‘

کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے وضاحت کی تھی کہ انقلابی پارٹی کی تعمیر کے لئے محض نظریہ ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس نظریئے کو محنت کش عوام کی وسیع پرتوں تک لے کر جانے کے لئے غیر معمولی جرات اور حوصلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جرات اور حوصلے کے فقدان کے باعث کچھ کامریڈ ماحول اور تناظر کے مطابق حکمتِ عملی تشکیل دینے کی

بجائے اپنی روٹین اور مزاج سے ہم آہنگ حکمتِ عملی کے مطابق معروضی حالات کی تشریح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی کیا گیا اور فعال کامریڈوں کو بے صبرے اور جلد باز کہہ کر اپنی بے عملی، کام چوری، مفاد پرستی اور بزدلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کہا گیا کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں ہونے والی سیاسی پیش رفتوں کو بنیاد بنا کر معروض کی تبدیلی کی عمومیت کو پاکستان اور بالخصوص بلوچستان کے حالات پر لاگو کرنے کی کوششیں صریحاً غلط ہیں۔ جبکہ یہ معززینِ تنظیم خود بلوچستان کے مخصوص حالات کو پاکستان کے عمومی تناظر اور بالخصوص پنجاب تک پر مسلط کرنے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ اپنی فضولیات میں وزن پیدا کرنے کے لئے فلسفے کی خوب لسی بھی بنائی گئی۔ ہمارا سیدھا سادھا موقف یہ تھا کہ حالات جتنے بھی مشکل ہوں کام کو روکا نہیں جا سکتا، اس کی شدت اور نوعیت کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے کبھی بھی ایسے مطالبات نہیں کئے تھے کہ بلوچستان اور وزیرستان میں بھی لاہور کی طرز کے کنونشن کئے جائیں۔ بہر حال ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب بلوچستان میں بھی کام کے واضح مواقع موجود ہیں۔ اور یہ فارمولا کہ 'انرجی بچاؤ تا کہ اسے درست وقت پر استعمال کیا جائے' ایک ردِ انقلابی، رجعتی اور بزدلانہ حکمتِ عملی ہے اور لینن کی بیان کردہ 'انقلابی پسپائیت (Revolutionary Defeatism) ' سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ لینن کے بقول انقلاب بھی ایک جنگ کی طرح ہے اور جنگ میں بعض اوقات فوجوں کو پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے تا کہ موقع ملتے ہی دشمن پر تابڑ توڑ حملے کئے جا سکیں۔ بلوچستان میں جب ڈاکٹرز، پیرا میڈیکل سٹاف، وکلا اور طلبا وغیرہ دوبارہ سیاسی مطالبات کے لئے آواز بلند کر رہے ہوں تو ایسے میں اپنے دفاتر اور گھروں میں بیٹھ کر درست وقت کا انتظار کرنا لڑنے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دینے کے مترادف ہے۔

انقلابی سخت تن دہی سے محنت کرتے ہوئے اپنی ذہنی اور جسمانی استطاعت سے زیادہ پارٹی کی تعمیر میں توانائیاں صرف کرتے ہیں۔ وہ معروض کے 100 فیصد انقلابی ہو جانے کا انتظار نہیں کرتے بلکہ انہیں کام کے جو بھی مواقع ملتے ہیں وہ اپنی قوتوں اور عمومی حکمتِ عملی کے تحت ان کو زیادہ سے زیادہ تنظیمی بڑھوتری کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ مشکل معروض میں قوتوں کو بچانا چاہئے اور انہیں صرف انقلابی دور میں استعمال کرنا چاہئے، اوپن ورک نہیں کرنا چاہئے، گھر میں بند ہو کر فلسفہ وغیرہ پڑھنا چاہئے، ہڑتالوں اور احتجاجوں میں شرکت نہیں کرنی چاہئے، انرجی بچانی چاہئے تا کہ جونہی معروض سازگار ہو تو آپ محنت کش طبقے کی قیادت کر سکیں، ایک سیاسی طور پر کند ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ صرف تنہائی میں فلسفہ اور معیشت پڑھنے سے کوئی بھی مارکسی کیڈر نہیں بن سکتا جب تک وہ براہِ راست سیاسی عمل کا حصہ نہ بنے۔ اگر آپ کسی پہلوان سے یہ کہیں کہ وہ زور لگانے کی مشق کرنا چھوڑ دے تا کہ اکھاڑے میں تازہ دم رہے، یا کسی اتھلیٹ کو یہ کہیں کہ وہ روزانہ بھاگ کر اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں تا کہ دوڑ کے مقابلے میں اول آ سکے یا کسی فاسٹ باؤلر کو کہیں کہ وہ پریکٹس میچوں میں حصہ ہی نہ لے تا کہ سارا زور لگا کر ورلڈ کپ میں وکٹیں لے سکے تو ان سب کے جوابی تاثرات کے بارے میں سوچ کر ہی بے ساختہ مسکراہٹ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

پی آئی اے کی فروری میں ہونے والی شاندار ہڑتال کے دوران یہ صورتحال واضح طور پر نظر آئی۔ یہ ہڑتال قیادت کی غداری کے باعث کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی لیکن جس طرح اس ہڑتال کا آغاز ہوا اور جیسے اس نے پی آئی اے کے تمام محنت کشوں کو جوڑا وہ پاکستان کی مزدور تحریک میں ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ 2 فروری کو جب کراچی میں نجکاری کیخلاف احتجاج کرنے والے پی آئی کے دو محنت کشوں کو شہید کر دیا گیا تو پورے ملک میں پی آئی اے کے ملازمین نے کام چھوڑ دیا اور ملک کی تاریخ میں پہلی دفعہ تمام اندرون ملک اور بیرون ملک پروازوں کا سلسلہ مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔ یہ ہڑتال تمام تر ریاستی جبر کے باوجود آٹھ دن تک جاری رہی۔ المیہ یہ ہے کہ ہڑتال کے آغاز سے صرف دو دن قبل اسلام آباد میں ہونے والی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں بہت سے سابقہ کامریڈز نے جوشیلے انداز میں تقاریر کیں کہ ملک میں جمود ہے اور کوئی بڑی تحریک موجود نہیں۔ پی آئی اے کی تحریک جو اس وقت احتجاجوں کی شکل میں جاری تھی اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ انتہائی معمولی سی تحریک ہے اور ایسی تحریکیں پہلے بھی کئی دفعہ چل کر دم توڑ چکی ہیں۔ جبکہ لال سلام کے موجودہ کامریڈز نے اس وقت بھی زور دیا کہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ جب دو فروری کو ہڑتال کا آغاز ہوا تو اپنی غلطی درست کرنے کی بجائے پی آئی اے کے مزدوروں کو ہی کوسنا شروع کر دیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ پیٹی بورژوا ہیں مزدور ہیں ہی نہیں۔ اسی طرح جن کامریڈز نے لاہور میں تحریک میں مداخلت کی کوشش کی انہیں ایکسپل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں اور کہا گیا کہ یہ ہڑتال اہمیت کی حامل نہیں۔ ہمیں اپنی "انرجی" یہاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعد ازاں IMT کی قیادت کی ہدایت اور ہڑتال کی رپورٹ طلب کرنے کے بعد بادل نخواستہ اس تحریک میں مداخلت کی گئی۔ اس کے باوجود یہ لکھا گیا کہ یہ عمومی دھارے کیخلاف ایک واقعہ ہے جبکہ اس وقت واپڈا، اسٹیل مل اور دیگر اداروں میں نجکاری کیخلاف تحریکیں موجود تھیں اور ریلوے کے محنت کشوں نے پی آئی اے کے محنت کشوں سے اظہار یکجہتی کے لیے احتجاج بھی کیا تھا۔ بہت سی بحثوں میں اس ہڑتال کو ریاست کے ایک دھڑے کی سازش بھی قرار دیا گیا۔ درحقیقت اپنے جمود کے تناظر کو درست ثابت کرنے کے لیے پی آئی اے کے محنت کشوں کی اس عظیم الشان جدوجہد کی تضحیک کی گئی جو کسی بھی انقلابی تنظیم کے لیے ناقابل قبول ہے۔ ایسے گھناؤنے جرائم کے بعد لال سلام کے موجودہ کامریڈز کا پرانی تنظیم میں دم گھٹنے لگا جو دلیری اور بے باکی سے اس ہڑتال میں سرگرم رہے۔ نہ صرف تمام تر دباؤ کے برخلاف ایک لیف لیٹ لکھا جو پوری تحریک میں تقسیم کیا جانے والا واحد لیف لیٹ تھا بلکہ ورکر نامہ بھی بڑی تعداد میں وہاں سیل کیا۔ اس

کے علاوہ جب کراچی میں محنت کشوں پر گولی چلی اس وقت بھی وہ وہاں مزدوروں کے شانہ بشانہ موجود تھے اور وہاں پر دلیری سے ریاستی جبر کا مقابلہ کرتے رہے۔ جبکہ کچھ لوگ اپنی انرجی بچانے کے لیے اس مشکل وقت میں منظر عام سے غائب ہو گئے۔

v۔ شخصیت پرستی کا ناسور

تیسری دنیا کی ثقافتی پسماندگی کا سب سے بڑا اظہار شخصیت پرستی کے اندر ہوتا ہے۔ لوگ اپنے ہی جیسے دوسرے افراد کی عقیدت، محبت اور اطاعت میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ افراد جن سے عقیدت اور تقدس برتا جارہا ہوتا ہے وہ بظاہر تو ان انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں جو ان کی عقیدت یا پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن دراصل وہ ان سے بالکل مختلف یا الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ کسی دوسرے فرد سے اپنے آپ کو منسلک کرکے یا اسے اپنا آپ سونپ کر اپنی محرومیوں اور ادھورے پن کی تکمیل و تسکین کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا ادراک نہیں ہوتا۔ خداؤں اور دیوتاؤں کے ساتھ بھی ان کا حقیقت میں اسی طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ جو خصوصیات ان میں نہیں ہوتیں وہ ان خصوصیات کو خداؤں سے منسوب کرتے ہیں اور اگر وہی خصوصیات انہیں اپنے ارد گرد زندہ انسانوں میں دکھائی دینے لگیں تو وہ ان کو بھی دیوتا کا درجہ دے بیٹھتے ہیں۔ تیسری دنیا کے پسماندہ معاشروں میں معاشی، جمالیاتی اور فنی محرومیاں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان معاشروں میں بہت سے خدا اور دیوتا (فنکار، ہیرو، فلمی ستارے، کھلاڑی، لیڈر) چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جن کو ٹراٹسکی 'پیلے آسمان' سے تشبیہ دیتا ہے۔

سوشلسٹ تحریکوں اور پارٹیوں میں بھی بدقسمتی سے بے شمار لوگ افراد اور شخصیات سے متاثر ہو کر ہی شامل ہوتے ہیں۔ پھر یہ ان پارٹیوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان افراد کی ذہنی تربیت کرتے ہوئے انہیں شخصیات کے سحر سے رہائی دلائے اور فلسفے، سائنس اور ادب یعنی بے بہا امکانات کی ایک دنیا سے ان کو روشناس کرائے تاکہ ان کے اندر خود اعتمادی اور کچھ کر جانے کا جذبہ پروان چڑھ سکے۔ دوسرے معنوں میں وہ یہ سیکھ سکیں کہ وہ شخصیتیں جن کی وہ پوجا کرتے آئے ہیں وہ بھی انہی کی طرح انسان ہی ہیں اور یہ ان کا ماحول ہی ہے جس نے ان کو یہ صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ یعنی وہ بھی اسی سماج کی پیداوار ہیں جس میں عام انسان سانس لیتے ہیں۔ یوں وہ صحیح اور غلط کی تمیز کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہوئے محض بھیڑ بکریاں نہیں رہ جاتے جن کو کوئی بھی چرواہا کہیں بھی چرا لے جائے بلکہ وہ نظریاتی بنیادوں پر کسی بھی سیاسی اور سماجی مسئلے کو سمجھنے اور حل کرنے کی سوجھ بوجھ حاصل کر لیتے ہیں۔ انقلابی تنظیموں کی یہی خصوصیت اسے باقی بورژوا پارٹیوں اور مروجہ سیاسی دھارے سے ممتاز اور بلند کر دیتی ہے۔

مارکسسٹ افراد کے کردار کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے بلکہ اسے مخصوص حالات کے اندر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ مارکسی پارٹیاں خود بھی اداروں کے ڈسپلن کے تحت مختلف اشخاص کا سماج میں کردار اور شناخت بنانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ ان کے ذریعے انقلابی نظریات کو سماج کی وسیع تر پرتوں تک پہنچایا جاسکے۔ لیکن اسی عمل کے دوران بدقسمتی سے تنظیموں اور پارٹیوں کے اندر بھی بت بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس خطرے کا سدِباب محض مضبوط اداروں اور آہنی ڈسپلن اور جوابدہی کے ذریعے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ سابقہ سیکشن میں بھی زیادہ تر ممبران نظریے سے زیادہ شخصیت سے وابستہ تھے اور جونہی تنظیم میں بحران پیدا ہوا تو انہوں نے شخصیت کی طرف دیکھنا شروع کر دیا کہ وہ کیا کرتی ہے اور اس کا کیا موقف ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی محبوب قیادت کوئی غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے، انہوں نے موجودہ لال سلام کے کامریڈوں کو بھی اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ 'جب استاد جی کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے، آپ ان کی بات مان لو اور اپنے موقف سے پیچھے ہٹ جاؤ'۔ ان ناصحین کی صلاح کو مسترد کر دینے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا کیونکہ 'استاد جی' کا موقف نہایت دقیانوسی اور پژمردہ تھا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا مطلب طبقے اور نظریات سے غداری تھا۔ یوں کسی نے شخصیت سے وفاداری نبھائی تو کسی نے نظریات کا دفاع کیا اور انہی بنیادوں پر سیکشن تقسیم ہو گیا۔

کچھ ایسے کامریڈ بھی تھے جو تمام تر متنازعہ نکات پر لال سلام کے موقف سے متفق تھے اور بارہا مختلف بحثوں میں اس کا اظہار بھی کر چکے تھے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی فیصلہ کن لڑائی میں اپنے 'دیوتا' کو ناراض نہ کر سکے۔ یہ مفادات کے رشتے تھے یا ان کی روحانی اور اعصابی غربت اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا مگر علیحدہ ہونے والے گروہ کی صفوں میں ہی نہیں بلکہ قیادت میں بھی ایسے کامریڈ خاطر خواہ تعداد میں موجود ہیں۔ یہی حقیقت میں شخصیت پرستی کا سماج دشمن (Anti Social)

پہلو ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کی تمام شعوری کاوشیں بے معنی اور بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اس سطح پر پہنچ کر شخصیت پرستی محض ایک سماجی بیماری نہیں رہ جاتی بلکہ خالصتاً انسانی المیے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ المیہ یہ نہیں ہے کہ بہت 'پڑھے لکھے' اور سمجھدار لوگ بھی شخصیت پرست ہوتے ہیں۔ یہ تو تیسری دنیا کے سماجی معمول کا جزوِ لاینفک ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی شخصیت پرستی کی دلدل میں غرق ہو جاتے ہیں جن کو پتہ ہوتا ہے کہ جس شخصیت کی پرستش میں وہ ہر حد سے تجاوز کرتے چلے جا رہے ہیں وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اس کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے اور وہ خود اس شخص سے زیادہ باصلاحیت، باعمل اور باکردار ہیں۔ اب وہ لوگ اپنی خجالت کو اس شخصیت کے ساتھ مصنوعی طور پر مسکراتے ہوئے تصویریں بنا کر مٹانے کی جتنی بھی کوشش کر لیں، یہ مٹ نہیں سکتی کیونکہ تصویر تو محض ایک لمحے کی عکاسی کر رہی ہوتی ہے اور آپ ایک لمحے کی قید میں کب تک مسکرا سکتے ہیں۔ یہ وہ فیصلہ کن معیاری سرحد ہوتی ہے جس سے آگے عزت اور احترام باضابطہ غلامی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر نظریاتی طور پر مضبوط کامریڈز عالمی مارکسی دھارے کا حصہ بن گئے ہیں اور باقی ماندہ کو ایک بالشویک تنظیم سے زیادہ نام نہاد قائد کی نجی جیل ہی کہا جا سکتا ہے۔

vi۔ کیا یہ ایک سازش تھی؟

نظریۂ سازش ہمارے ہاں ویسے ہی بہت مقبول ہے۔ یہاں مورخین جو علمِ تاریخ کی ابجد سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں وہ تمام تاریخی واقعات، جنگوں اور انقلابات تک کو بھی بادشاہوں کے ذاتی افعال اور محلاتی سازشوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ یہاں ادب کے تمام کردار بھی انہی خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں۔ گھروں میں بزرگ بچوں کو جو کہانیاں سناتے ہیں ان میں بھی بھوت پریت کے علاوہ سازشوں اور بے وفائیوں کے قصے ہی ہوتے ہیں۔ یوں کسی بھی پیچیدہ عمل کی وضاحت سے فرار حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی بھی زید بکر کی سازش قرار دے دیا جائے۔ حالیہ پھوٹ کے دنوں میں بھی سابقہ قیادت نے جن کامریڈوں کو ایکسپل کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا ان پر پہلے مہم جوئی کا الزام لگایا گیا۔ پھر انہیں مفاد پرست ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور جب ان سب چیزوں سے بات نہ بنی تو بالآخر سازشی تھیوری کا سہارا لینا پڑا۔ سیاسی اختلافات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دے دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ معروض کی تبدیلی کی کہانی مصنوعی طور پر گھڑی ہے اصل میں یہ کامریڈ قیادت کا تختہ الٹ کر اس کی 'سلطنت' پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ الزامات ہی اکثریتی دھڑے کے تنظیم کی طرف رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔ جب انٹرنیشنل کی قیادت کو اس قسم کے تمام پروپیگنڈے کے باوجود اپنے مذموم ایجنڈے کی تکمیل کے لئے استعمال نہ کیا جا سکا تو نظریۂ سازش کی توپوں کا رخ انٹرنیشنل کی قیادت کی طرف موڑ دیا گیا۔

پہلے یہ کہا گیا کہ کامریڈ ایلن وڈز تو ہمارے ساتھ ہے مگر IS کے کچھ کامریڈز اسے بہکانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ایلن وڈز کی پوزیشن ہتھیانا چاہتے ہیں۔ جب کامریڈ ایلن وڈز نے کھل کر اس غلیظ اور مکروہ بہتان طرازی کا پردہ چاک کیا تو انہیں ہی ساری سازش کا خالق قرار دے دیا گیا جنہوں نے مبینہ طور پر پاکستانی سیکشن کی CS کے کامریڈوں کو مختلف قسم کے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا تاکہ 'استاد جی' کو رستے سے ہٹایا جا سکے کیونکہ ساری انٹرنیشنل اس بات کی خواہشمند ہے کہ 'استاد جی' لندن میں انٹرنیشنل سیکرٹریٹ (IS) کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ انٹرنیشنل کے زیادہ تر کامریڈ ایلن وڈز سے تنگ ہیں اور انٹرنیشنل میں بڑے پیمانے کی پھوٹ پڑنے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔ جہاں شروع شروع میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ موجودہ لال سلام کے چند کامریڈ ISI کے ایجنٹ ہیں وہیں بعد میں ساری IS ہی کے CIA کے ایجنٹ ہونے کے الزامات بھی سامنے آئے۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن پر غصہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں تھوڑا سا تعجب ضرور ہوا مگر اب لگتا ہے کہ ان سب باتوں کو 'سیاسی لطیفے' کے عنوان سے کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے تاکہ انقلابیوں کی آئندہ نسلوں کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو کہ بڑے بڑے مہان ناموں کے اندر کیسے کیسے متعفن انسان چھپے ہوتے ہیں، یا پھر جیسے کامریڈ ایلن وڈز اکثر کہتے ہیں کہ 'گرنے والا گہرائی نہیں دیکھتا'۔

لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم لال سلام کے کامریڈز بالکل بے خبر تھے اور اس ناگہانی حادثے نے ہمیں اچانک آ دبوچا۔ صورتحال ان دونوں کیفیات سے بالکل مختلف تھی۔ ہم مارکسسٹ محض حالات اور واقعات کے رحم و کرم پر نہیں ہوتے ہیں بلکہ ہم ہر سطح پر اپنی شعوری مداخلت کر رہے ہوتے ہیں۔ اس شعوری مداخلت کو بھلے ہی کوئی سازش کا نام دے دے لیکن اصل میں یہی تنظیموں اور پارٹیوں کی سیاسی زندگی اور صحت کی ضمانت ہوتی ہے۔ سابقہ اقلیتی دھڑے (موجودہ لال سلام) کے کامریڈوں نے اپنا سارا موقف ہمیشہ اداروں میں تنظیمی طریقہ کار اور ڈسپلن کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کامریڈوں تک پہنچانے کی کوشش کی تاکہ اس پر کھل کر بحث ہو سکے۔ اگر کبھی انفرادی ڈسکشن میں بھی کسی کامریڈ سے بات کی گئی تو اسی موقف کو آگے بڑھایا گیا جو طویل عرصے سے ریجنل، ایریا اور نیشنل کانگریسوں میں برملا رکھا جا رہا تھا اور اس میں

کوئی چھپانے والی بات تھی ہی نہیں۔ مثال کے طور پر معروض کی تبدیلی کی بحث اچانک یا مصنوعی طور پر نہیں بنائی گئی تھی بلکہ سالانہ کانگریسوں کی دستاویزات میں کئی برس سے بار بار اسے لکھا جا رہا تھا۔ ہمیں تناظر اور تنظیم میں سے جس بھی دستاویز کو لکھنے کا موقع ملا ہم نے معروض کی تبدیلی کا کھل کر پرچار کیا۔ ان تمام دستاویزات کے حوالے تو یہاں نہیں دیئے جاسکتے مگر چند مثالیں پیش کرنا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ مثلاً 2015ء کے 'پاکستان تناظر' کی دستاویز کے پہلے باب کا عنوان ہی 'انجام اور آغاز' ہے۔ پورا باب تو یہاں پر نقل نہیں کیا جاسکتا اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کا لب لباب یہ تھا کہ ایک عہد اپنے انجام کو پہنچا اور نئے عہد کا آغاز ہو چکا۔ اس سے بھی پہلے 2014ء کی تنظیم کی دستاویز کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ "2013ء کے واقعات سے بھرپور سال کا اختتام ہو چکا ہے جبکہ 2014ء کا ہنگامہ خیز سال بانہیں کھولے ہمیں کامیابیوں کی جانب پکار رہا ہے۔ 2013ء کے سال میں یہ حتمی طور پر واضح ہو گیا کہ دنیا ایک نئے عہد میں داخل ہو چکی ہے۔"

اسی طرح اس غلیظ پروپیگنڈے کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ 'استاد جی' کے خلاف کامریڈوں کو اکسایا جا رہا تھا اور فلاں سال میں فلاں کامریڈ سے اس نوعیت کی گفتگو کی گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی فرد سے نہیں بلکہ تنظیمی لیڈ آف اور دستاویزات میں کھل کر تنظیمی جمود اور ثقافتی وسیاسی مسائل پر بحث کی جا رہی تھی۔ افراد کے ساتھ کی جانے والی بحثیں بھی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تنظیمی جمود کے ذمہ داران ہوشیار ہو گئے تھے اور وہ اس بحث کو بجا طور پر اپنے خلاف سمجھ رہے تھے اور جوابی حملے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ گزشتہ سالوں میں تنظیمی دستاویزات سے ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر ہم صرف 2015ء کے تنظیمی دستاویز سے چند اقتباسات نقل کرنا چاہیں گے جن سے تنظیم کے اندر کئی سال سے جاری شعوری کشمکش کو سمجھنے میں آسانی ہو گی:

1۔ "انقلابی تنظیم کے لئے روٹین ازم کا سوال محض تجریدی نہیں بہت زیادہ عملی بلکہ کبھی کبھار کلیدی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ تناظر بنانے سے لے کر شعبہ جاتی تقسیم کار تک ہر چیز اس کی بھینٹ چڑھ سکتی ہے۔ وقتی آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے بالشویک روایات اور اصول طاقِ نسیاں بھی بن سکتے ہیں۔ اندرونی وبیرونی دونوں محاذوں پر روٹین کی دقیانوسیت کے خلاف ان تھک اور مسلسل جدوجہد کا نام ہی بالشوازم ہے۔ بے شک طریقہ کار کو انتہائی لچکدار ہونا چاہیئے مگر 'ابھی کونسا انقلاب سر پہ کھڑا ہے' کہہ کر طریقہ کار کو اس حد تک لچکدار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی انقلابی اساس ہی زائل ہو جائے۔ 'وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا' کی سوچ وہ زہر قاتل ہے جو ایک دم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ اور غیر محسوس طریقے سے تنظیموں کی رگ وپے سے کچھ کر گزرنے اور ٹکرا جانے کی صلاحیت کو نچوڑ کر انہیں چلے ہوئے کارتوس کی طرح ناکارہ بنا دیتی ہے۔"

2۔ "تیسری دنیا کی عمومی نفسیات کے زیرِ اثر ہم خود افراد کے مبالغہ آمیز کردار کے عادی اور متلاشی ہوتے ہیں۔ مسیحاؤں کی یہی تلاش ہمیں ہمیشہ بیمار رہنے کی لت ڈال دیتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہوتا ہے کہ مافوق الفطرت شخصیات سے تاریخی فرائض کو منسلک کر کے ہم اپنی سستی اور کاہلی کو سماجی جواز فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔"

3۔ "کامریڈ ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ ہر وہ طریقہ اور رویہ ہمارے لئے اخلاقی طور پر درست اور قابلِ ستائش ہے جو تنظیمی کام کو آگے بڑھانے میں ممد ومعاون ہو۔ لیکن یہاں پر یہ امر وضاحت طلب ہے کہ تنظیمی کام کو آگے بڑھانے کی اصطلاح موضوعی یا انفرادی نہیں بلکہ معروضی اور ادارہ جاتی ہونی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر مغزبات کا الٹ استعمال ایسے ہونا شروع ہو جائے جیسے پاکستان کے عسکری ادارے ہمیشہ اپنی سیاسی مہم جوئیوں کو جواز فراہم کرنے کے لئے 'قومی مفاد' کی اصطلاح استعمال کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمہوری اور انقلابی سوچ رکھنے والوں کے لئے یہ تعریف ناقابلِ قبول ہے۔ اسی طرح 'تنظیمی مفاد' کی تعریف وتوضیح کا فریضہ تنظیمی ہے اور اس میں کسی بھی فرد کو استثنا حاصل ہونا پوری تنظیمی سرگرمی کے لئے زہر قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔"

4۔ "اگر دیانتدارانہ خود احتسابی سے کام لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہماری بڑھوتری میں سکتے اور جمود کی بنیادی وجہ ڈھانچوں کی فعالیت سے زیادہ افراد کی کارکردگی پر انحصار ہے۔ ہمارے ڈھانچوں کی جو کیفیت ہے اس کے ساتھ دو سے اڑھائی ہزار کی تنظیم کو ہی چلایا جاسکتا ہے۔ ڈھانچوں کی یہ مقناطیسی کشش وہ عامل ہے جو تھوڑے سے مقداری اضافے کو دوبارہ گھما کر واپس اسی سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ یہ دوطرفہ جدلیاتی عمل ہے بہرحال ڈھانچوں کے افراد پر منحصر ہونے کی کلیدی وجوہات سے انکار کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہو گا۔"

5۔ "شخصیت پرستوں کو کبھی اس کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ اپنی نااہلی کی تسکین کے لئے جس شخصیت کی جعلی تعریف اور خوشامد کر رہے ہوتے ہیں وہ اسے فائدہ پہنچانے کی بجائے تباہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی لئے کامریڈ ایلن وڈز نے وینزویلا کا انقلاب نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ہم اسے دوست نہیں سمجھتے جو اونچا اونچا دہراتے رہیں کہ واہ واہ

آپ نے کمال کر دیا بلکہ ہمارے نزدیک دوست وہ ہوتا ہے جو ضرورت پڑنے پر ہمیں گریبان پکڑ کر جھنجوڑے کہ میاں یہاں تم نے بڑی غلطی کی۔ 'اکثر رومی شہنشاہوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آخری ایام میں نیم پاگل ہو جایا کرتے تھے۔ اسی لئے فاتح افواج کی سلامی کے وقت ایک غلام انکے ساتھ تعینات کر دیا جاتا تھا جو مسلسل بادشاہ کے کان میں یہ جملہ دہراتا رہتا تھا کہ 'یاد رکھو کہ تم صرف ایک انسان ہو۔' کوئی بھی شخص جو ضرورت سے زیادہ بااختیار ہو، ایسے لوگوں میں گھرا رہے جو اسے محض وہ بتائیں یا سنائیں جو وہ سننا چاہتا ہو ایسی صورت میں ذہنی توازن کا بگڑنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پاگل پن در حقیقت اصل حقائق کا احساس ختم ہو جانا ہی تو ہوتا ہے۔ اس لئے صرف اور صرف مضبوط، منظم اور متحرک ادارے ہی انقلابی تنظیم کو انقلابی کہلوانے کا حق دے سکتے ہیں۔ ہمیں ہر قیمت پر یہ حق جیتنا ہو گا۔"

بر سرعام اور علی الاعلان اپنے موقف کا پرچار کرنے والوں کو کبھی سازش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بزدل، نکمے اور منافقین کا وطیرہ ہوتا ہے جو مخالفین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی نہیں سکتے، اسی لئے ہر فورم پر بحث سے بھاگ جاتے ہیں۔ اس میں دلچسپ اور مزاحیہ بات یہ ہے کہ یہ تمام دستاویزات نیشنل کانگریسوں سے اتفاقِ رائے سے پاس بھی ہوتے رہے ہیں اور 'اکثریت' خود ان الفاظ کو دہراتی اور سراہتی بھی رہی ہے۔ اس سے اکثریت کی سیاسی سطح اور ثقافتی معیار کا با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

vi۔ 'ہماری تنظیم'

بہت سے ایسے کامریڈ جو سالہاسال سے تنظیم کے اہم اداروں کے اندر اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں لیکن طویل عرصے سے ایک ہی شعبے میں ایک ہی کام کر رہے ہوتے ہیں، ان کے اندر ساری تنظیم کی طرف بہت میکانکی رویہ جنم لیتا ہے۔ یا پھر ایسے پرانے کامریڈ جنہوں نے تنظیم کے کام کے آغاز میں بہت اہم کردار ادا کیا ہوتا ہے، ان کے اندر انتہائی غیر محسوس طریقے سے تنظیم کی ملکیت کا احساس پروان چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایک وقت میں انہوں نے واقعتا تنظیم اور نظریئے کے لئے بہت قربانی دی ہوئی ہوتی ہے یا ایک مشکل اور کٹھن مرحلے میں تنظیم کو زندگی اور موت کی کشمکش سے نکالنے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہوئی ہوتی ہیں لیکن وہ لاشعوری محرکات کے زیر اثر تنظیم کو اپنی پراپرٹی کے طور پر برتنا اور چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ معمول کے دنوں میں خود ان کو یا تنظیم کو اس بات کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ لیکن جب نئے لوگ نئے طریقوں اور نئے عزم کے ساتھ تنظیم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایک بحرانی کیفیت جنم لیتی ہے اور اس بحرانی کیفیت میں لاشعوری محرکات شعوری حرکات وسکنات میں اپنا اظہار کرنے لگ جاتے ہیں۔ آئے روز 'نئے' اور 'پرانے' کی نوک جھوک شدت پکڑتی جاتی ہے اور یہ نوک جھوک بالآخر ایک دھماکہ خیز حادثے کی شکل میں پھٹ جاتی ہے۔ اس احساسِ ملکیت کو انسانی جسم میں کسی مہلک اور جان لیوا وائرس کے ساتھ مشابہت دی جا سکتی ہے جو بے حد خاموشی اور چالاکی سے کسی بھی زندہ جسم میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے مگر موقع ملتے ہی اس زندہ جسم پر ایسا بہیمانہ جان لیوا حملہ کرتا ہے کہ اس کو سنبھلنے اور مدافعت کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔

حالیہ پھوٹ میں بھی اس قسم کے رویئے غالب نظر آئے جب نوجوان کامریڈوں کو یہ طعنہ عام طور پر سننے میں ملتا تھا کہ 'تم کل کے بچے ہو، ہم نے یہ تنظیم بنائی ہے'۔ دوسرے معنی میں ' یہ ہماری تنظیم ہے تم نکل جاؤ'۔ ایسے بزرگ، سینیئر یا تجربہ کار کامریڈوں سے ہم انتہائی مودبانہ گزارش یہ کرتے ہیں کہ آپ نے تنظیم اور محنت کش طبقے کے لئے جو بھی کیا اس کا کوئی نعم البدل نہیں لیکن اب آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم کسی بھی فرد کے شاندار ماضی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں مگر شاندار ماضی کی بنیاد پر کسی بھی فرد کو تنظیم اور محنت کش طبقے کے حال اور بالخصوص مستقبل کے ساتھ کھلواڑ کرنے کا لائسنس جاری نہیں کیا جاسکتا۔ بصورتِ دیگر یہ کامریڈ اپنے آپ کو تنظیمی ڈسپلن اور قواعد وضوابط سے مبرا اور بالاتر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ اپنی مرضی اور رائے کو ہی تنظیمی قاعدے کے طور پر مسلط کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے رویوں کے جواب میں تنظیم کی طرف سے فطری طور پر مزاحمت ضرور ابھرتی ہے لیکن اگر اس کو شعوری اظہار نہ ملے تو یہ مزاحمت زائل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تنظیم واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے، ایک طرف یہ نام نہاد مالکان ہوتے ہیں اور دوسری طرف عام کارکنان۔ یوں تنظیم کا ایک فعال اکائی کے طور پر کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہم نے ماضی میں بھی اس قسم کے رویوں کے خلاف لڑائی لڑی ہے اور مستقبل میں بھی اس طرح کی کوئی روش برداشت نہیں کی جائے گی۔ حالیہ پھوٹ میں اس قسم کے مالکانہ رویے کا سب سے واضح عملی مظاہرہ بلوچستان ریجن میں سامنے آیا جہاں پر 'مالکان' کی طرف سے خود ہی ریجنل کمیٹی بلائے بغیر ہی ساری ریجنل کمیٹی کی طرف سے انٹرنیشنل کو فرضی قرارداد ارسال کر دی گئی۔ یہ زینوویف ازم کی واضح علامات تھیں اور ستم

ظریفی یہ تھی کہ یہی کامریڈ بعد میں اپوزیشن پر زینوویف ازم کا الزام عائد کر رہے تھے۔ اسی روش کی وجہ سے اکثریت عالمی مارکسی دھارے سے کٹ کر 'ہماری تنظیم' کی کال کوٹھڑی میں مقید ہو گئی۔

vii۔ قوم پرستی کا زہر

مارکسی اساتذہ نے بار بار یہ وضاحت کی ہے کہ انقلابی تنظیموں میں جنم لینے والی پھوٹ یا گراوٹ آخری تجزیئے میں نظریاتی زوال پذیری ہی کی کوئی نہ کوئی شکل ہوتی ہے۔ زیادہ تر ان تضادات کا اظہار چھوٹے موٹے تنظیمی امور کی انجام دہی کے حوالے سے ہونے والی نوک جھوک میں ہوتا ہے۔ اس نوک جھوک کو افراد کے مابین اتھارٹی کی کھینچاتانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو بھی تو اس کے پس پردہ کوئی نہ کوئی نظریاتی مواد ضرور کار فرما ہوتا ہے۔ اور اگر طریقہ کار یا لائحہ عمل کے اوپر شدید اختلافات ابھر کے سامنے آتے ہیں (جیسا کہ حالیہ پھوٹ میں ہوا) تو گہرائی میں مشاہدے سے پتہ چلے گا کہ درحقیقت معروضی حقائق کی مختلف یا متضاد نظریاتی تشریحات ہی عملی میدان میں راستے الگ کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اس لئے کسی بھی پھوٹ سے اہم اسباق حاصل کرنے کا واحد حل یہی ہوتا ہے کہ اس نظریاتی مواد کی درست چھان بین کی جائے اور مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

حالیہ پھوٹ کے معاملے میں یہ کوئی مشکل چیلنج نہیں ہے بلکہ نام نہاد اکثریت کی طرف سے انٹرنیشنل کو ارسال کی گئیں قراردادیں یا ان کی قیادت کی تحریروں سے ہی با آسانی ان کی نظریاتی زوال پذیری کی شدت اور سطح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں کا ایک ایک لفظ قوم پرستی کے زہر سے آلودہ اور متعفن محسوس ہوتا ہے۔ کئی کئی سال سے یہ تقریریں کرنے والے کہ 'مارکسزم اگر انٹرنیشنلزم نہیں تو کچھ بھی نہیں' اگر یہ لکھیں کہ 'اگر ہماری سنٹرل کمیٹی کی بات نہ مانی گئی تو ہم انٹرنیشنل چھوڑنے پر مجبور ہوں گے' تو کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہتا کہ وہ غلیظ پیٹی بورژوا قوم پرستی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو چکے ہیں۔ یہ کہنا کہ ہمارے سیکشن کی اکثریت ہی تمام فیصلے کرنے کی مجاز ہے، انٹرنیشنلزم اور جمہوری مرکزیت کی ابجد سے روگردانی نہیں تو اور کیا ہے۔ پاکستان میں بھی دیگر ملکوں اور خطوں کی طرح بائیں بازو کا یہ المیہ رہا ہے کہ قوم پرستی کو بھی مارکسی نظریات ہی کا ایک تسلسل یا وجود سمجھا جاتا تھا۔ یا ثقافتی رنگ ڈھنگ میں دونوں کو یوں گڈمڈ کر دیا جاتا تھا کہ ان کی الگ الگ شناخت مشکل ہو جاتی تھی۔ خاص طور پر سندھ اور پشتونخواہ میں سب قوم پرست اپنے آپ کو مارکسی کہتے تھے جبکہ سب مارکسی قوم پرستوں کی غیر مشروط حمایت کرنے کو لازمی قرار دیتے تھے۔ بدقسمتی سے سابقہ سیکشن پر بھی غیر محسوس طریقے سے کچھ اسی قسم کے رجحانات کے اثرات پڑتے رہے۔ نجی محفلوں میں بیٹھ کر قومی تعصبات اور محرومیوں کی کھچڑی اکثر پکائی جایا کرتی تھی۔ ان تمام رجحانات کا حالیہ پھوٹ میں کھل کر اظہار ہوا۔

کراچی جو محنت کشوں کا سب سے بڑا شہر ہے، جہاں ہر قومیت کے لوگ آباد ہیں اور تنظیم کے اندر بھی ہر قومی پسِ منظر سے تعلق رکھنے والے کامریڈوں کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے، وہاں دورانِ پھوٹ بلوچ کامریڈوں کو بلوچستان کے بلوچ کامریڈوں سے، پشتون کامریڈوں کو خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے پشتون کامریڈوں سے، سندھیوں کو سندھ کے مہان انقلابیوں سے اور کشمیری کامریڈوں کو کشمیر سے فون کروائے گئے کہ وہ اکثریت کا اس بنا پر ساتھ دیں کہ ان کی قوم کے اکثریتی کامریڈ بھی اسی طرف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر اکثریتی دھڑے کے تقریباً تمام لوگوں نے نوجوان کامریڈوں سے گفتگو کے دوران ان کو مشتعل کرنے کے لئے انٹرنیشنل کی قیادت کے خلاف نسل پرستانہ زبان کا استعمال کیا۔ یہ زہر اور تعفن پھر محض فون کالز تک محدود نہیں رہا بلکہ کھلم کھلا سوشل میڈیا کی زینت بھی بنا جہاں سابقہ سنٹرل کمیٹی کے عظیم کامریڈ بھی یہ کہتے ہوئے پائے گئے کہ 'ان گوروں نے سینکڑوں سال ہمارے اوپر حکمرانی کی، اب اس کا بدلہ لینے کا بھی وقت آ گیا ہے'۔ اب کہا جا رہا ہے کہ یہ خواتین و حضرات نئی مگر 'اپنی' انٹرنیشنل بنانے کے لئے سرگرم ہیں۔ جب بنیادوں میں ہی قوم پرستی کا زہر ہو تو پرولتاریہ کی بین الاقوامیت کا نعرہ کسی دیوانے کا خواب ہی معلوم ہوتا ہے۔

یہاں سبق آموز بات یہ ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اتنا طویل عرصہ انٹرنیشنل کی سیاست کرنے کے باوجود بھی لاشعور میں قوم پرستی کا یہ تعفن کیونکر موجود رہ سکتا ہے؟ یہ کوئی لمبا چوڑا مشکل اور ناقابلِ حل غیر سائنسی سوال نہیں ہے بلکہ بنیادی نظریات کا سوال ہے۔ جب ابتدا میں یا یوں کہہ لیں کہ 'رجعتی' معروض میں یہ کہہ کر قوم پرستی جیسے بدبودار رجحانات کے لئے ایک انٹرنیشنل تنظیم کے اندر گنجائش یا قبولیت پیدا (Accomodate) کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ ابھی معروضی حالات موافق نہیں ہیں لہٰذا تھوڑی بہت نظریاتی اونچ نیچ سے کام چلا لیا جائے۔ جب وقت (انقلاب) آئے گا تو سارے معاملات خود بخود معروضی طور پر ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔

یہ بیک وقت خطرناک مہم جوئی بھی ہوتی ہے لیکن اصل میں یہ موقع پرستی کی غلیظ ترین شکل ہے جب جلدی جلدی کوئی فردیا تنظیم اپنی شہرت اور مقبولیت کو بڑھانے کے لئے نظریاتی ڈسپلن پر سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ یہ تھوڑی بہت نظریاتی اونچ نیچ اگرچہ مقداری طور پر تھوڑی بہت ہوتی ہے مگر معیاری طور پر دو متضاد نظریات کے بدترین ملغوبے کو جنم دیتی ہے۔ اور بحران کے دنوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی واضح ہو جاتا ہے۔

سابقہ پاکستانی سیکشن میں یہ نظریاتی سمجھوتے ایک معمول کی بات تھی اور یہی وجہ ہے کہ سیکشن کی نظریاتی بنیادیں ہی دیمک زدہ ہو چکی تھیں۔ یہاں اس نظریاتی اپروچ کی صرف ایک مثال دینا ہی کافی ہو گا۔ گزشتہ برس جب تربت میں قوم پرست جنونیوں کے ہاتھوں غریب محنت کشوں کا قتلِ عام کیا گیا جس میں درجن بھر محنت کش ہلاک ہوئے جن کا تعلق سندھ اور جنوبی پنجاب سے تھا، تو ہم نے اس بربریت کے خلاف ملک گیر احتجاج کی کال دی تھی۔ ہمارا مدعا یہ تھا کہ اس سفاکانہ اقدام کے ذریعے جہاں محنت کشوں کا ناحق خون بہایا گیا ہے وہیں خود قومی آزادی کی تحریک کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا گیا ہے کیونکہ اس طرح کے اقدامات دنیا بھر کے محنت کشوں میں بلوچ قومی تحریک کو بدنام کرنے کا موجب بنیں گے۔ بلوچستان ریجن کی سابقہ قیادت نے نہ صرف یہ کہ بلوچستان میں اس ایشو پر احتجاج کرنے سے انکار کر دیا بلکہ جس پرچے اور ورکر نامہ میں اس احتجاج کی رپورٹس شائع کی گئیں ان پرچوں کو تقسیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس موضوع پر پرچے میں شائع ہونے والے مضمون کو بھی بے جا تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حوالے سے جب ریجنل سیکرٹریز کی میٹنگ میں انہوں نے اپنا موقف پیش کیا تو ہم نے ان کی کسی حد تک باز پرس کی مگر جواباً انہوں نے حسبِ دستور سابقہ قائد کی خوشامد کر کے اپنے موقف پر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا جبکہ ان کے 'پیر صاحب' نے بھی حسبِ دستور موقع پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے بات کو گول مول کر دیا۔

مذکورہ ریجن کی یہی قوم پرستانہ روش ہی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے مشکل معروض اور سیکورٹی رسک کا بہانہ بنا کر گزشتہ کئی سالوں سے 'سنٹر کی مداخلت' نہ ہونے کے برابر کر دی تھی اور ریجن کی تنظیم کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح کی صورتحال سندھ کے ایک ریجن میں بھی تھی جہاں سنٹر کی بے جا مداخلت جیسے جملے عام طور پر سننے میں مل جاتے تھے۔ چند یار دوستوں کے ٹولے کا نام تنظیم رکھ دیا گیا تھا اور تنظیمی میٹنگز کو عیاشی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی انٹرنیشنل نے ان خامیوں کو بھانپ لیا اور اسے درست کرنے کی کوشش کی تو اسے انٹرنیشنل کی 'بے جا مداخلت' سمجھا جانا اسی روش کا منطقی نتیجہ تھا۔ جہاں تنظیم میں اس طرح کے رویوں کو قبول کرنا سابقہ قیادت کی مجرمانہ غفلت کے زمرے میں آتا ہے وہیں یہ قیادت کے اپنے مذموم مقاصد کی غمازی بھی کرتا ہے جو انٹرنیشنل کے اندر بھی ایک متوازی ڈسپلن کی تعمیر کے لئے چالبازی اور جعلسازی کی ہر حد پار کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی۔

viii۔ کانگریس کی نوعیت اور ممبر شپ کا دائرہ کار

انقلابی تنظیمیں بہت سے شعبوں اور اداروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہر شعبے اور ادارے کے کام کے دائرہ کار متعین ہوتے ہیں مگر مستقل یا ناقابلِ تغیر نہیں ہوتے۔ مختلف وقت اور معروض میں برانچ سے لے کر کانگریس اور فنانسز سے لے کر یوتھ ورک تک ہر ادارے اور شعبے کے کردار اور دائرہ کار کو تبدیل اور معروض سے ہم آہنگ کرنا ہی بالشویک قیادت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ادارے اور شعبے خود مقدس یا برتر نہیں ہوتے بلکہ کام کو منظم کرنے اور پھیلانے کے لئے آلات کے طور پر بنائے اور چلائے جاتے ہیں۔ ہر وقت نئے شعبوں اور اداروں کی ضرورت موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات کچھ ادارے وقتی طور پر کسی خاص ٹاسک کے لئے ہنگامی بنیادوں پر بھی تشکیل دیئے جاسکتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود پھر بھی کسی خاص وقت اور حالات میں اداروں اور شعبوں کے کام کو الگ الگ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ پھر ان کو جوڑ کر ایک منظم کُل کو مضبوط بنیادوں پر چلایا جاسکے۔ ایک زندہ جسم کی طرح زندہ تنظیموں میں بھی کام کی تقسیم فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ تقسیم اداروں اور شعبوں کے مابین بھی ہوتی ہے اور اداروں اور شعبوں کے اندر مختلف افراد اور ذمہ داران کے مابین بھی۔ مختلف جگہوں پر اداروں کا کام بھی مختلف ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ کسی دوسرے ادارے کا کام شروع نہیں کر دیتا۔ مثلاً کراچی کی کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے اندر تنظیم کی برانچ سندھ یا جنوبی پنجاب کے کسی دور دراز دیہی علاقے کی برانچ سے مختلف ہو گی مگر پھر بھی وہ اپنے اہداف اور کارکردگی کے حوالے سے برانچ ہی رہے گی اور ریجنل یا ایریا کمیٹی کے فرائض انجام نہیں دے گی۔ اسی طرح لاہور اور کوئٹہ میں یوتھ ورک کرنے کا انداز مختلف ہو سکتا ہے مگر اسے ٹریڈ یونین ورک سے گڈمڈ نہیں کیا جانا چاہئے۔ ٹیم کی کمی کے باعث بعض اوقات ایک ہی فرد کو مختلف شعبوں اور اداروں میں فعال کردار ادا کرنا پڑ رہا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اداروں، شعبوں اور افراد کے کام کی تخصیص کے بغیر مطلوبہ اہداف اور نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

ایک مشکل معروض میں نیشنل کانگریس کے ادارے نے تنظیم کی بڑھوتری میں بہت اہم کردار ادا کیا مگر اس اہم کردار کی ادائیگی کے لئے کانگریس کو اپنے مخصوص ادارہ جاتی کام سے دستبردار ہونا پڑا۔ کانگریس کو تنظیم کے سرگرم اور مخلص ممبران اور کیڈرز کے سالانہ اکٹھ سے ہٹ کر بائیں بازو کے رجحانات رکھنے والے ہم خیال (Like Minded) لوگوں کے سیاسی جلسے اور ثقافتی میلے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ ایک مخصوص معروض میں جب تک ثقافتی میلے اور سیاسی جلسے الگ سے منعقد کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا تب تک تو کانگریس کا یہ وطیرہ (Version) ضروری بھی تھا اور قابلِ قبول بھی۔ کیونکہ اتنے سارے لوگوں کو ایک چھت کے نیچے اکٹھا ہونے، انقلابی شاعری اور گانوں پر جھومنے اور پر جوش نعرے بازی کرتا دیکھنے سے انقلاب کی امید کو تقویت ملتی تھی اور انقلابیوں کا مورال بلند ہوتا تھا۔ لیکن اس کانگریس کی اس شکل (Form) نے ناگزیر طور پر اس کے مواد (Content) کو بھی متاثر کرنا تھا۔ یوں اس جلسہ نما کانگریس کے مثبت اثرات سے زیادہ منفی اثرات بھی تھے بلکہ کہیں زیادہ منفی تھے کیونکہ بالاترین ادارے کی اس قسم کی کیفیت کے باعث برانچ تک تمام زیریں ادارے تعطل پذیر نمو (Stunted Growth) کا شکار ہو گئے تھے۔ ہر شعبہ خوفناک اتھل پتھل سے دوچار تھا اور ہر ادارہ شدید ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یوں یہ سب معروض کا جبر نہیں تھا بلکہ شدید ترین تنظیمی کمزوریوں اور صلاحیتوں کے فقدان کی غمازی بھی کر رہا تھا جن کی جلد یا بدیر درستگی اور اصلاح انقلابیوں کی سب سے بڑی ذمہ داری تھی مگر مرکزی قائد کے ذاتی اتھارٹی کو مستحکم کرنے کے لئے تیز ترین عددی ترقی کے خبط نے تنظیم کی معیاری اور جبلی خصوصیات کو یکسر فراموش اور قربان کر دیا۔ یوں کانگریس ایک فعال ادارے سے زیادہ ایک مقدس اور مذہبی تہوار بن گئی اور اس کے شرکا کی اکثریت لڑاکا انقلابیوں سے رفتہ رفتہ بے عملے زائرین میں تبدیل ہو گئی۔

2008ء کی کانگریس اس سارے عمل کے اندر ایک معیاری تبدیلی کی نشاندہی کر رہی تھی کیونکہ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے کانگریس ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر یہ ملغوبہ نما کانگریس کا منطقی عروج تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کانگریس نے تنظیم کے اندر پھوٹ کو واضح کر دیا تھا۔ اس کے بعد ایک بالکل مختلف شکل اور کردار کی حامل کانگریس درکار تھی۔ اس کانگریس میں 1200 کے قریب شرکا نے شرکت کی تھی جن کا 40 فیصد سے بھی زیادہ وزیٹرز پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد کبھی اس سے زیادہ لوگ اکٹھے نہیں کئے جا سکے۔ کانگریس کا کردار اپنی نفی میں بدل چکا تھا اور ایک ممبر شپ یا مندوبین کی کانگریس کی طرف بڑھنے کی ضرورت تھی اور تنظیم کے اندر مختلف سطحوں پر اس بحث کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ مگر اس بحث کو منظم شکل میں متعلقہ ادارے تک پہنچنے میں سات سال لگ گئے اور بالآخر 2015ء کے ستمبر میں اسلام آباد میں ہونے والی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ میں اس پر باضابطہ ووٹنگ ہوئی اور اتفاقِ رائے سے ابتدائی مرحلے میں صرف ممبرز کی کانگریس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ یکم سے تین جنوری 2016ء کو کراچی میں ہونے والی سنٹرل کمیٹی میٹنگ میں اس پر دوبارہ ووٹنگ ہوئی اور متفقہ طور یہ فیصلہ دوبارہ کیا گیا۔

یہ کانگریس شیڈول کے مطابق 2016ء کے مارچ میں منعقد ہونی تھی۔ بعد ازاں پرانی روٹین کے سرکردہ اور روحِ رواں صاحبان نے جوڑ توڑ کر کے اس فیصلے کو واپس کروانے کا عزم کر لیا تھا۔ انٹرنیشنل کی قیادت کو فرضی کہانیاں سنا کر اور جھوٹ بول کر ورغلایا گیا اور انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعے اس فیصلے کو واپس کر دیا۔ جس کی وجہ سے تنظیم کے سنجیدہ کیڈرز میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور اس سے قبل کہ IEC کی میٹنگ میں اس معاملے پر تفصیلی بحث ہو پاتی، اس خوف سے کہ کہیں IEC کے سامنے حقائق آشکار نہ ہو جائیں، یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا کہ کچھ کامریڈ کانگریس کو سبوتاژ کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ IEC کی میٹنگ میں جب تفصیلی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ کانگریس میں تمام متنازعہ نکات پر بحث اتاری جائے گی تو کانگریس کو ہی منسوخ کر دیا گیا۔

ممبر شپ کانگریس کے خلاف روٹین زدگان کی طرف سے اتنے بہیمانہ ردِ عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ممبر شپ کانگریس سے ماضی میں نہ صرف کانگریس کی تعداد کے حوالے سے بلکہ ممبر شپ کے اعداد و شمار کے حوالے سے بولے گئے تمام جھوٹ بے نقاب ہو جانے تھے۔ ممبر شپ کانگریس کے انعقاد کی بحث کے اندر ہی ممبر شپ کی تعریف و تشریح کے حوالے سے بحث موجود تھی۔ ماضی میں ممبر شپ کا کوئی واضح طریقہ کار یا دائرہ کار موجود نہیں تھا۔ اس لئے اعداد و شمار کو مصنوعی طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں ایک مقابلہ بازی کی سی نفسیات موجود تھی۔ مرکزی قیادت ان جعلی اعداد و شمار سے بہلتی رہتی تھی اور حقیقت میں یہ بیماری ایک خطرناک وائرس کی طرح تنظیم کو اندر سے کھوکھلا کر چکی تھی۔ اس لئے ہم نے واضح طور پر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ جو شخص ہمارے نظریات اور طریقہ کار سے متفق ہونے کے ساتھ ساتھ برانچ کی میٹنگ میں شرکت کرے، ماہوار چندہ دے، پیپر خریدے اور تنظیمی بڑھوتری میں اپنا کردار ادا کرے صرف وہی ہمارا ممبر ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی نیا ضابطہ نہیں تھا بلکہ سالہا سال سے تنظیمی دستاویزات میں موجود تھا لیکن بس اب اس پر عملدرآمد کروایا جا رہا تھا۔ ان شرائط کے تحت تنظیم کی ممبر شپ بمشکل ہی 500 کے لگ بھگ تھی۔ یوں محض تنظیم کے غبارے سے ہی ہوا نہیں نکلنی تھی بلکہ مہان شخصیات کے بلبلے بھی پھٹ جانے تھے اور تمام تر مذہبی تقدس اور عقیدت پامال ہو جانی تھی۔ غرضیکہ تمام بت پاش پاش ہو جانے تھے مگر بتوں نے کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔

ix۔ نرگسیت اور سیاسی بیگانگی

پاکستانی سیکشن کی تعمیر اگرچہ بالشویک بنیادوں کی حامل نہیں تھی اور بے شمار کوتاہیوں اور کمزوریوں سے مزین تھی پھر بھی یہ ایک استثنا تھی۔ اس عرصے میں نہ صرف یہ کہ ہماری انٹرنیشنل کے کسی بھی سیکشن میں ایسی گروتھ نہیں ہو رہی تھی بلکہ بحیثیت مجموعی پوری دنیا میں بائیں بازو کی تنظیمیں اور پارٹیاں، بالخصوص ٹراٹسکائیٹ گروپس زوال کا شکار تھے۔ پاکستان کا بایاں بازو شدید بحران کی لپیٹ میں تھا۔ بہت سی سٹالنسٹ پارٹیاں اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی تھیں جبکہ نام نہاد ٹراٹسکائیٹس NGO's کے دھندے سے مال بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ وقتاً فوقتاً اپنی بقا کے لئے ان سب پارٹیوں نے بہت سے اتحاد بنائے مگر ہر بار تین پارٹیوں کے اتحاد سے چھ پارٹیوں کا جنم ہوا۔ ایسی صورتحال میں صرف IMT کا پاکستانی سیکشن ہی وہ واحد رجحان تھا جو بظاہر بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بائیں بازو کے حلقوں میں ہر وقت پاکستانی سیکشن اور اس کی قیادت کو ہی زیرِ بحث لایا جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ تنظیم کے داخلی امور وغیرہ کو سائنسی بنیادوں پر سمجھنے کی صلاحیت سے معذور ہونے کے باعث تمام تر خوبیوں اور خامیوں کا سہرا سیکشن کی قیادت کے سر باندھ دیتے تھے۔ سیکشن میں ہونے والی ہر پھوٹ پر جہاں سیکشن کے اندر کہیں کوئی پر مغز بحث موجود نہیں ہوتی تھی وہیں بائیں بازو کی دیگر پارٹیاں اس پر اپنے اپنے طریقے سے بحث کرتی تھیں اور گھما پھرا کر تمام تر معاملات کی ذمہ داری ایک فردِ واحد پر عائد کر دی جاتی تھی۔

اسی وجہ سے تنظیم کے اندر ایک نہایت خطرناک رجحان جنم لے چکا تھا جسے تلف کرنا تنظیم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ بجائے اس کے کہ اپنے کام کی کمزوریوں اور خامیوں کی جڑ تک پہنچ کر ان کا انسداد کرنے کی کوششیں کی جاتیں، ہر وقت خود کو بائیں بازو کی دیگر پارٹیوں سے موازنے کے ذریعے برتر اور بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ تلخ تنظیمی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے اپنی تنظیم کو مہان اور غلطیوں سے ماورا سمجھنے کا خبط زیادہ تر کامریڈوں پر طاری تھا۔ اپنی سال بھر کی بے عملی کی نفسیاتی تلافی کرنے کے لئے سالانہ کانگریس میں شرکت کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چھ ماہ کانگریس کی تیاری کی جاتی تھی اور باقی کے چھ ماہ 'کامیاب' کانگریس کے نشے میں بدمست ہو کر گزار دیئے جاتے تھے۔ یوں تمام تر تنظیمی سرگرمیوں کا محور و مرکز ہی کانگریس تھی۔ ذریعہ خود مقصد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کوئی بھی اور کہیں بھی اگر کسی بھی ادارے میں تنظیمی کارکردگی کے حوالے سے تنقیدی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا تھا تو اسے خود شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ تنظیم ایک کُل کے طور پر سماج سے مسلسل کٹتی جا رہی تھی اور خود اپنے اندر دھنستی جا رہی تھی۔ یہ تنظیم کی بتدریج سیاسی بیگانگی کا عمل تھا جو برق رفتاری سے چل رہا تھا۔ تنظیم کے اندر اگرچہ اس سارے عمل کے خلاف بھی ایک مزاحمت تھی مگر وہ مزاحمت فوری طور پر فیصلہ کن شکل اختیار کرنے سے قاصر تھی۔

تنظیم کے بارے میں جب بھی کہیں کوئی گفتگو ہوتی تو کامریڈوں پر عجیب روحانی سرشاری طاری ہو جاتی۔ عمومی تنظیمی سوچ یہی بن گئی تھی کہ بتدریج اور خودرو طریقے سے کامیاب کانگریسوں کے تسلسل سے ہی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ زیادہ تر یہی سمجھتے تھے کہ یہ ایک تاریخی لازمہ ہے کہ اگر سوشلسٹ انقلاب ہونا ہوا تو ہر صورت میں اس کی قیادت ایک خودرو طریقے سے ہماری تنظیم ہی کرے گی۔ یہ سراسر تنظیمی نرگسیت تھی جس کا بالشویک جذبات اور نظریات سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ نرگسیت کا ہی بنیادی خاصہ تھا کہ تنظیم کی تمام تر حاصلات کو زندہ سماجی قوتوں، انٹرنیشنل کی طاقت اور افراد کے کردار کے باہمی ربط میں دیکھنے کی بجائے میکانکی طور پر ایک فرد کی کرشماتی صلاحیتوں اور معجزاتی کاوشوں کے مرہونِ منت سمجھا جاتا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے نصاب کی کتابوں میں درج ہے کہ پاکستان قائد اعظم نے بنایا۔ ویسے ہی پرانے سیکشن کی اکثریت کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ یہ تنظیم ایک فردِ واحد نے بنائی ہے، اور وہ فردِ واحد ظاہر ہے ایسا ہی کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ 'وقت کے لینن' اور 'عہد کے مارکس' جیسی بیہودہ اور غیر سائنسی اصطلاحات تنظیم میں اکثر سننے کو مل جاتی تھیں۔ مارکس اور لینن کے لئے اگر کوئی سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت طرزِ فکر ہو تا تو شاید وہ یہی ہوتا۔ مختصراً یہ کہ ایک فرد کو سیاسی پیغمبری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اور پھر پیغمبروں کے ساتھ ان کے صحابی، تابعین، تبع تابعین وغیرہ تو ہوتے ہی ہیں۔

اس سوچ کا سب سے زیادہ اگر کسی کو نقصان ہونا تھا یا ہوا تو وہ خود وہی فردِ واحد تھا جس نے خود اس بات پر کامل یقین کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس تنظیم کی بڑھوتری کی واحد وجہ خود اس کی ذات اور صفات ہیں۔ اس نے نظریئے کی اہمیت، انٹرنیشنل سے منسلکیت کا امتیاز اور باقی کامریڈوں کی ان تھک محنت وغیرہ کو ایک ثانوی اور فروعی چیز سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اگر اس نے تنظیم کو بنایا تھا تو تنظیم نے بھی اس کو بنایا تھا۔ تنظیم کے بغیر اس کا کوئی سیاسی و سماجی تشخص ہی نہیں تھا۔ بورژوا میڈیا میں بائیں بازو کی واحد آواز کے طور پر شناخت نے اس خود پسندی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ 'میرا پروگرام' اور 'میرا کالم' سب سے زیادہ بولے جانے والے الفاظ ہوتے تھے۔

رہی سہی کسر روحانی غربت زدہ خوشامدیوں، مفاد پرستوں اور چمچہ گیروں کی مستقل صحبت نے پوری کر دی تھی۔ صبح و شام 'پیر و مرشد' کے حضور اتنی 'واہ واہ' گونجتی تھی کہ لکھنو کے مشاعروں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یوں موصوف کے اندر خوفناک انانیت، محنت سے فرار اور خود نمائی جیسے جراثیم میں دن دگنا اور رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک طرف یہ سیاسی نودولتیے پن کی انتہا تھی تو دوسری طرف یہ خود پرستی اور نرگسیت کا بھی نقطہ عروج تھا۔ صرف برجستگی اور بے ساختگی سے آئینے میں خود کو چومنے کی ہی کسر باقی رہ گئی تھی۔ انقلاب پرسے یقین ایسے ہی پر اسرار طریقے سے غائب ہو گیا تھا جیسے 1100 کی نشستوں والے ہال میں پر اسرار طریقے سے 2800 لوگ بیٹھ کر انقلابی فرائض کی تکمیل کیا کرتے تھے۔

ایسے میں آمرانہ طرزِ سیاست بھی ناگزیر طور پر در آیا۔ جب اور جسے چاہا نکال دیا اور جسے چاہا نواز دیا۔ موصوف کے نزدیک تنظیمی عہدوں کے حصول کا بنیادی میرٹ صرف یہی رہ گیا تھا کہ کون کتنی 'واہ واہ' کرتا ہے اور کون موصوف سے حقیقی معنوں میں مرعوب ہے۔ جس پر تھوڑا سا بھی گمان گزرا کہ یہ جناب کی قدر و منزلت سے ایسے متفق نہیں ہے جیسے ہونا چاہئے اس پر پیٹی بورژوا ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ جس کسی کو بھی تنظیم سے نکالا گیا یا خود تنظیم سے علیحدہ ہوا وہ سیاسی طور پر زوال پذیری کا شکار ہو گیا۔ یوں حضور کا زعم اور بھی بڑھ گیا کہ اس کے تمام فیصلے درست ہوتے ہیں اور 'آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'۔ اس پھوٹ کے دنوں میں بھی حضور کو کامل یقین تھا کہ جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ آخر میں وہ اکثریت بچانے میں اگرچہ کامیاب ہو گیا لیکن اس حقیقت کو اس سے بہتر اور کون جانتا ہے کہ یہ اس کی زندگی کی بدترین شکست ہے اور اس اکثریت کی بنیادیں کتنی جعلی اور مصنوعی ہیں۔ یہ ایک نامور ٹراٹسکائیٹ کی زوال پذیری کا وہ زندہ عمل تھا جس میں ہم نے رخنہ ڈالنے کی ان تھک کوششیں کیں مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اس متعفن کور چشمی اور گمراہ کن موضوعیت کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ آئندہ بھی اس قسم کے رجحانات اور اس کے درپردہ محرکات کے خلاف ناقابلِ مصالحت اور غیر متزلزل لڑائی کسی بھی شکل میں اور کسی بھی قیمت پر جاری رکھی جائے گی۔

x۔ ثقافتی عنصر

کسی بھی تنظیم کی سیاسی طاقت کا اظہار اس کے ثقافتی معیار کے اندر ہوتا ہے۔ کامریڈوں کی آپس کی بول چال، ان کے رویئے، ان کا کردار اور ان کا حسِ مزاح یہ تمام چیزیں نہ صرف انفرادی طور پر انکی بلکہ اجتماعی طور پر اس تنظیم کی جس نے ان کی تربیت کی ہوتی ہے، سیاسی پختگی اور انقلابی درجہ حرارت کی غمازی کر رہے ہوتے ہیں۔ سابقہ سیکشن کی نظریاتی گراوٹ کا سب سے بڑا اظہار بھی اس کے غلیظ ثقافتی ماحول میں ہونے لگا تھا۔ زیادہ تر کامریڈ نجی محفلوں میں ایک دوسرے کی چغلیاں کرتے ہوئے اور ایک دوسرے پر اپنی لابی بنانے یا گروپ بندی کرنے جیسے الزامات لگاتے ہوئے پائے جاتے تھے مگر جب ایک دوسرے کے سامنے آتے تو منافقت اور ریاکاری کی تمام حدیں پار کر جاتے۔ وہ سب کامریڈ اکثریت کی چھتری تلے آجکل متحد ہیں اور نظریہ ضرورت کے تحت ایک دوسرے پر جان چھڑکنے کا کھلواڑ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عام طور پر ڈسکشن میں بھی نظریات سے زیادہ شخصیات اور افراد کو ڈسکس کیا جاتا تھا، ان کے سکینڈلز بنائے جاتے اور انکی نجی زندگیوں پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا۔ خاص طور پر آپس میں بیٹھ کر غلیظ قسم کے جنسی لطیفوں کا تبادلہ معمول بنتا جا رہا تھا۔ باہمی عزت و احترام کی جگہ مقابلہ بازی کی نفسیات حاوی ہو چکی تھی۔ گالم گلوچ اور بیہودہ طرزِ تخاطب عام ہو گیا تھا۔ اور یہ سب طرزِ عمل جہاں پر ایک طرف اس بدنما سماجی ثقافت ہی کی دین تھا وہاں دوسری طرف تنظیم کی قیادت، جسے عقیدت اور احترام کے باعث قابلِ تقلید سمجھا جاتا تھا، کی اپنی معمول کی طرزِ معاشرت بھی ایسی ہی تھی جس کو زیادہ تر کامریڈ خاص طور پر دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کامریڈ ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

لمپنائزیشن تنظیم کے اندر نیچے سے لے کر اوپر تک ہر سطح پر موجود تھی۔ ایسے میں جس سماجی پرت کا تنظیم کے اندر سب سے زیادہ دم گھٹتا تھا وہ خواتین کامریڈ تھیں۔ خاص طور پر جو بڑھ چڑھ کر تنظیمی فرائض ادا کرنے کی کوشش کرتی تھیں انہیں قدم قدم پر اس طرح کے غلیظ رویوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تنظیم کی ملکیت کے دعویدار خواتین پر بھی حقِ ملکیت جتانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خواتین کے کام کا شعبہ کبھی بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ اس ثقافتی پسماندگی کی ایک اہم وجہ اداروں اور ڈھانچوں میں پرولتاریہ کی نمائندگی کا آٹے میں نمک سے بھی کم کے برابر ہونا ہے۔ زیادہ تر کامریڈوں کا پس منظر چونکہ مڈل کلاس کا ہوتا تھا اسی لئے ان کے منفی رویئے اتنے راسخ اور ٹھوس ہو چکے ہوتے تھے کہ ان کو بدلنے کے لئے جو تنظیمی معمول درکار تھا اس کے فقدان کے باعث یہ رویئے تبدیل ہونے کی بجائے اور

بھی زیادہ مضبوط ہونا شروع ہو جاتے تھے۔ اسی لئے پھوٹ کے بعد ہم نے محنت کشوں کی ریکروٹمنٹ کو سب سے زیادہ ترجیحی بنیادوں پر رکھا ہے تاکہ درمیانے طبقے کی فرسٹریشن، جلد بازی اور لمپنائزیشن پر مبنی تنظیمی معمول کا خاتمہ کر کے صحتمند تنظیمی ثقافت کو پروان چڑھایا جاسکے۔

یوں حالیہ پھوٹ کی وجوہات کے تفصیلی تجزیئے اور چھان پھٹک کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ کسی طور بھی کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ یہ انقلابی عمل کا ایک ناگزیر تسلسل تھا، جسے جلد یا بدیر ہر صورت میں وقوع پذیر ہونا ہی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پھوٹ کے بعد IMT کے پاکستانی سیکشن کی اکثریت شعوری بنیادوں پر تمام محرکات کو سمجھتی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طرح براہِ راست اس عمل سے گزرا ہے، اسے پرکھا ہے اور کسی بھی شخصیت کے زیرِ اثر نہیں بلکہ آزادانہ طور پر محض نظریاتی بنیادوں پر نتائج اخذ کئے ہیں۔ اور ہماری سب سے بڑی کامیابی ہی یہ ہے جس کی بنیاد پر ہماری ناکامی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ ہم نے سیاسی طور پر اپاہج، نفسیاتی طور پر متعفن اور نظریاتی طور پر معذور کٹھ پتلی اکثریت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اور اب بالکل تازہ دم نوجوان کیڈروں کی ایک بڑی تعداد اور 9 فل ٹائمرز کے ساتھ ہم انقلابی سفر کی غیر معمولی شروعات کر رہے ہیں۔ اب ہمیں بالکل نئی بنیادیں رکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ ہم نہ صرف حالیہ بلکہ ماضی کی تمام ترٹوٹ پھوٹ سے اخذ کئے گئے اہم اسباق کی روشنی میں ایک بالکل مختلف عہد کے اندر انقلابی تنظیم کی بنیادیں رکھ رہے ہیں۔ ہم نے جو لوگ کھو دیئے ہیں وہ ماضی کے مزار تھے اور ایک جگمگاتا ہوا سرخ سویرا ہمارا منتظر ہے۔